www.UrduFanz.com
مشینی مخلوق
اشتیاق احمد

محمود، فاروق، فرزانہ اور انسپکٹر جمشید سیریز ۳۰

مشینی مخلوق

اشتیاق احمد

بار اول : یکم ستمبر ۱۹۸۱
مطبع : زاہد بشیر پرنٹرز لاہور
خطاطی : مہر عبدالستار راجہ جنگ
قیمت : پانچ روپے پچاس پیسے

مکتبہ اشتیاق راجپوت مارکیٹ پہلی منزل، اردو بازار لاہور

دو باتیں

مشینی مخلوق سے مل کر آپ خوش ہوتے ہیں یا ناخوش، کچھ کہہ نہیں سکتا، اس کے ساتھ آپ کو زنرے کا فرار، خونی دھماکے اور جنت میں قبر بھی ملیں گے، دیکھ لیجیے، کیسی کیسی چیزیں آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ اس کے باوجود بھی آپ شکایات کا دفتر کھولتے ہیں تو اسے میں اپنی بدقسمتی ہی خیال کروں گا۔

آئندہ ماہ یعنی اکتوبر میں آپ صرف ایک ناول یعنی خاص نمبر ہی پڑھ سکیں گے، لیکن گھبرایئے نہیں، بوکھلایئے بھی نہیں، یہ تنہا ناول چار ناولوں کے برابر ہی ہو گا اور آپ کو کوئی کمی محسوس نہیں ہو گی۔ اور پھر مزے کی بات یہ کہ قیمت تین ناولوں سے بھی کم! اور ہاں میری طرف سے تمام پڑھنے والوں کو عید مبارک، ان سب کا دل سے شکریہ جنہوں نے عید کارڈ بھیجے۔

لیجیے دو باتیں ختم اور مشینی مخلوق شروع، اور آپ غائب!

اشتیاق احمد

ترتیب

آخری الفاظ

علامہ عادت کھڑکیوں کے شیشوں پر ٹک ٹک ٹھک ٹھک کی آوازیں سن کر چونک اٹھے۔ وہ ابھی ابھی اپنے غسل خانے سے باہر آئے تھے — باہر نکلتے ہی انہوں نے یہ آواز سنی — ان کے منہ سے فوراً نکلا:

"ہائیں، کیا بارش شروع ہو گئی — لیکن ابھی تھوڑی دیر پہلے تو بارش کے کوئی آثار نہیں تھے — سورج چمک رہا تھا — آسمان بالکل صاف تھا۔"

یہ کہتے ہوئے وہ کھڑکی کی طرف آئے — شدید سردی کے دن تھے — اس لیے وہ کھڑکیوں کے شیشے گرا کر سوتے تھے — کمرے کا کوئی روشندان باہر کی طرف نہیں کھلتا تھا۔ البتہ ان کے کمرے کی کھڑکیاں سڑک کی طرف کھلتی تھیں۔ ٹک ٹک ٹھک ٹھک کی آواز انہی کھڑکیوں پر ہو رہی تھی — لیکن جونہی وہ کھڑکی کے نزدیک پہنچے، ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں — مارے حیرت کے ان کا بُرا حال ہو گیا — ان کی سمجھ میں نہ آ سکا کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور پھر انہوں نے شیشوں کو تڑخنے محسوس کیا۔

"ارے باپ رے، یہ..... تو ان شیشوں کو توڑ کر رکھ دیں گی۔ میں نے کتنے قیمتی شیشے لگوائے تھے۔" ان کے منہ سے نکلا۔

عدنان عارف ایک سرکاری ملازم تھے۔ بہت فرض شناس آدمی تھے۔
انہوں نے زندگی میں کبھی رشوت نہیں لی — یوں اگر وہ رشوت لینا شروع کر دیتے
تو اس وقت نہ جانے کتنی ناجائز دولت کے مالک ہوتے — وہ ایک ایسی
ہی جگہ پر ملازم تھے — پلوں اور بندوں وغیرہ کی تعمیرات کے ٹھیکے دینا ان
کے اختیارات میں تھا۔ ٹھیکیدار راتوں کو ان کے ہاں آتے تھے اور ٹھیکے
لینے کے لیے لاکھوں روپے کی رشوتیں پیش کی تھیں، مگر انہوں نے کبھی
ان رقوم کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا — ہمیشہ صرف ان لوگوں
کو ٹھیکے دیے تھے جو ایماندار ثابت ہوئے تھے اور جنہوں نے تعمیرات
میں کوئی گڑبڑ نہیں کی تھی — انہوں نے یہ کبھی نہیں کیا تھا کہ بے ایمان
لوگوں کو کم قیمت پر ٹھیکے دے دیے اور ناقص پل وغیرہ تعمیر کرا لیے —
وہ ہمیشہ اچھے لوگوں کو ٹھیکے دیتے اور اس طرح حکومت کو زیادہ قیمت
کے ٹھیکے قبول کرنا پڑتے — لیکن چونکہ حکومت کو عدنان عارف پر پورا
بھروسا تھا۔ اس لیے کبھی اعتراض نہیں کیا گیا — یہی وجہ تھی کہ ان کے
ہوتے ہوئے کبھی کوئی کمزور پل نہیں بنا تھا — ابھی کچھ ہی دنوں پہلے ملک
میں ایک بہت بڑا ڈیم تعمیر کرنے کا پروگرام بنایا گیا تھا — اس سلسلے میں
ملک کے بہت بڑے بڑے ٹھیکیدار ان سے مل چکے تھے — ایک ٹھیکیدار نے
تو انہیں ایک کروڑ روپے کی رشوت بھی دینا منظور کر لی تھی، لیکن انہوں
نے صاف انکار کر دیا تھا — ابھی تک یہ ٹھیکہ کسی کو نہیں دیا گیا تھا —
عدنان عارف کی پسند کا کوئی ٹھیکیدار ابھی تک نہیں ملا تھا۔

یہی عدنان عارف اس وقت حیرت زدہ انداز میں کھڑکیوں کے شیشوں کو
دیکھ رہے تھے — شیشے ترختے دیکھ کر انہیں خوف کا احساس ہوا۔ انہوں نے
سوچا، مجھے ضرور اپنی بیٹی کو بلا لینا چاہیے — اسے اس قسم کی کتابیں پڑھنے
کا جنون ہے — شاید وہ کچھ بتا سکے — یہ سوچ کر انہوں نے اپنی بیٹی
ثمینہ عارف کو بلانے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ ایک شیشہ ٹوٹ کر اندر کی
طرف گرا۔ اس کے ساتھ ہی زناٹے دار آواز آئی — یہ منظر ان کی زندگی کا
حیران کن ترین منظر تھا، لیکن اس کے بعد جو منظر انہیں دیکھنا پڑا، وہ حیران
کن ہی نہیں خوفناک ترین بھی تھا۔ وہ خوف زدہ آواز میں چلائے:

”ارے ارے — یہ کیا — بیٹی مجھے بچاؤ۔“

لیکن ان کی بیٹی تو اپنے کمرے کے غسل خانے میں نہا رہی تھی — وہ
ان کی آواز کس طرح سن سکتی تھی۔ وہ زور زور سے ہاتھ ہلا کر اور گھما
کر خود کو بچانے کی کوشش کر رہے تھے۔ انہیں ایک شدید جلن محسوس ہوئی۔
ان کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی — وہ حلق پھاڑ کر چلائے:

”بیٹی ثمینہ مجھے بچاؤ۔“

یہ تیز آواز ان کی بیٹی کے کانوں تک پہنچ گئی — وہ پریشان ہو گئی۔
جلدی جلدی کپڑے پہنے اور باہر نکل کر اپنے ڈیڈی کے کمرے کی طرف
دوڑی — لیکن دروازہ اندر سے بند تھا — اس نے چیخ کر کہا:

”کیا بات ہے ڈیڈی، دروازہ کھولیے —“

”مم — مجھے بچاؤ بیٹی — مجھے بچاؤ — آ — ہی — ا — ہی — آ —“ لیکن

نہیں — تم اندر نہ آنا — ورنہ، ورنہ — یہ تمہیں بھی — ہاں — یہ تمہیں بھی —"

ان الفاظ کے بعد آواز آنا بند ہو گئی — ثمینہ نے دروازے پر ایک زور دار ٹکر ماری، لیکن بھلا اس "ننک منک" سی لڑکی سے وہ دروازہ کیا ٹوٹتا، وہ ٹس سے مس بھی نہ ہوا، اب وہ باورچی خانے کی طرف بڑھی — باورچی خانہ کوٹھی کے پچھلے حصے میں تھا، وہاں ان کا ملازم شامی ناشتہ تیار کر رہا تھا —

"شامی جلدی چلو، ڈیڈی کو نہ جانے کیا ہو گیا ہے" ثمینہ نے گلا پھاڑ کر کہا — شامی گھبرا گیا — سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اپنے مالک کے کمرے کی طرف بھاگا۔ ثمینہ نے بھی اس کے پیچھے دوڑ لگا دی —

"دروازہ توڑ ڈالو شامی، ڈیڈی اندر نہ جانے کس حال میں ہیں"

شامی نے دروازے پر ٹکر ماری — لیکن دروازہ بہت مضبوط تھا — عدنان عارف نے یہ کوٹھی خود بنوائی تھی اور ہر کام پختہ کرایا تھا۔ کوٹھی تھی بھی شہر سے ذرا ہٹ کر — اور یہاں آس پاس کوٹھیاں بہت دور دور تھیں۔

"بے بی کسی کو مدد کے لیے بلائیے جلدی — اوپر سے بھی آواز دے لیں" شامی نے بوکھلا کر کہا اور بدستور ٹکریں مارتا چلا گیا۔ ثمینہ وہاں سے ہٹ کر برآمدے میں آئی اور جھک کر سڑک کی طرف دیکھنے لگی — اسے کچھ فاصلے پر دو .... لڑکے آتے دکھائی دیے، وہ چلانے لگی:

"دوڑ کر آؤ — جلدی آؤ"

لیکن ان تک اس کی آواز نہیں پہنچ سکی اور وہ بے تاب ہو کر زینے

کی طرف دوڑنے لگی — اور پھر تیزی سے سیڑھیاں اتر کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھی —

٭٭٭

"بھیں —"

انہوں نے اپنے سر کے اوپر یہ تیز آواز سنی — چونک کر اوپر دیکھا اور حیران رہ گئے:

"یار فاروق، یہ کیا؟" محمود کے منہ سے نکلا۔

"مکھیوں کا لشکر، تم اتنا بھی نہیں دیکھ سکتے — کہیں ان دنوں تمہاری نظر تو کمزور نہیں ہو رہی"

"مکھیوں کا لشکر، ہوں — اور تمہارا شاید دماغ ان دنوں چل گیا ہے — کبھی مکھیوں کو بھی لشکر کی صورت میں کہیں جاتے دیکھا ہے؟"

"شہد کی مکھیاں تو لشکر کی صورت میں سفر کرتی دیکھی ہیں میں نے" فاروق نے مسکرا کر کہا۔

"لیکن یہ شہد کی مکھیاں نہیں ہیں"

"ہاں، یہ تو میں بھی کہہ رہا ہوں اور سچ تو یہ ہے کہ تمہاری طرح حیران میں بھی ہوں — لیکن خیر، ہمیں ان کے لیے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں — ہو سکتا ہے کہ کسی مکھی کی شادی ہو اور یہ مکھیوں کی بارات جا رہی

ہوتے"

"مکھی کی شادی" محمود کے منہ سے نکلا اور اس نے فاروق کو کی جانے والی نظروں سے گھورا۔

"ہاں بھئی — ناممکن تو نہیں — مکھیاں اسی صورت میں لشکر بن کر جا سکتی ہیں"

"دیکھو مکھیاں اوپر ہی اوپر ہوتی جا رہی ہیں"

"شادی والا گھر کہیں بہت اوپر ہوگا" فاروق بڑبڑایا۔

"وحشت تیرے کی" محمود نے جھلا کر ران پر ہاتھ مارا۔

"آگئی ران کی شامت — ارے، وہ دیکھو" فاروق نے بعد والا جملہ چونک کر کہا:

"کیا دیکھوں، کیا کوئی اور مکھیوں کا لشکر آ رہا ہے"

"نہیں، شاید مکھیوں کی ملکہ پیچھے رہ گئی ہے، وہ لشکر کو ہاتھ ہلا ہلا کر روکنے کی کوشش کر رہی ہے" فاروق نے کچھ فاصلے پر دیکھتے ہوئے کہا۔ محمود نے بھی اس طرف دیکھا۔

"وحشت تیرے کی — وہ تو لڑکی ہے اور ہمیں بلا رہی ہے"

"شاید ہم دور سے اُسے مکھیاں ہی نظر آ رہے ہیں" فاروق بولا۔

"آؤ، جلدی کرو — شاید اسے ہماری مدد کی ضرورت ہے"

"اور کیا — مدد کرنے کے لیے اس دنیا میں ایک ہم ہی تو رہ گئے ہیں" فاروق نے منہ بنایا —

"ایک ہم نہیں، تین ہم" محمود مسکرایا اور جلدی جلدی قدم اٹھانے لگا — فاروق کو بھی اس کا ساتھ دینا پڑا، لیکن وہ جھلائے ہوئے انداز میں قدم اٹھا رہا تھا —

دونوں کو آج سکول کا کام نہیں ملا تھا، اس لیے انہوں نے نیشنل پارک میں جانے کی بجائے شام کی سیر کا پروگرام بنایا تھا — شہر کی اس سمت میں وہ کبھی نہیں آئے تھے اور نئے علاقے دیکھنے کا انہیں بہت شوق تھا، اس لیے ادھر چلے آئے تھے — دونوں تیز تیز چلتے لڑکی کے قریب پہنچے —

"کیا بات ہے بہن" محمود نے جلدی سے پوچھا۔

"اوپر ..... میرے ڈیڈی سخت خطرے میں ہیں۔ مہربانی فرما کر اوپر چلیے — شاید آپ کچھ مدد کر سکیں"

"شاید نہیں، ہم یقیناً مدد کر سکیں گے" یہ کہہ کر محمود تیزی سے اندر گھس گیا —

"اوپر" لڑکی چلائی —

اور وہ سیڑھیاں چڑھنے لگا — فاروق نے بھی اس کا ساتھ دیا — دونوں آندھی اور طوفان کی طرح اوپر پہنچے، جہاں شادی بدستور دروازے سے ٹکریں مار رہا تھا، وہ سمجھ گئے کہ جو کچھ ہے، اس کمرے کے اندر ہے — چنانچہ محمود نے بلند آواز میں کہا:

"آپ ہٹ جائیں، ذرا ہمیں کوشش کرنے دیں"

شامی نے چونک کر ان کی طرف دیکھا اور پھر حیرت زدہ سا ایک
طرف ہٹ گیا — محمود اور فاروق دوڑتے ہوئے دروازے کی طرف آئے
اور اپنے شانوں کو دروازے سے ٹکرا دیا — اس وقت تک ثمینہ بھی اوپر
پہنچ چکی تھی — اس نے دروازے کی چولوں کو ہلتے دیکھا تو حیران ہوئے
بغیر نہ رہ سکی — فوراً ہی محمود اور فاروق پھر پیچھے ہٹے اور دوسری
ٹکر دے ماری — آخر پانچویں ٹکر پر دروازے کے قبضے ٹوٹ گئے اور
وہ اندر داخل ہوئے — ثمینہ بھی دوڑ کر اندر پہنچی — شامی نے بھی
پھرتی دکھائی اور پھر ثمینہ کی دلدوز چیخ نے کمرے کو ہلا کر رکھ دیا —
انہوں نے دیکھا، کمرے کے فرش پر ایک آدمی چت پڑا تھا۔
حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس کے چہرے کا گوشت اس حد تک پھول
گیا تھا کہ اس کے نقش و نگار غائب ہو گئے تھے — آنکھیں تو بالکل نظر
نہیں آ رہی تھیں۔ بس ناک کی نوک کا ذرا سا حصہ نظر آ رہا تھا۔ دوسرے
لفظوں میں چہرہ بالکل گیند کی شکل اختیار کر گیا تھا اور اس کا رنگ بھی
بالکل سرخ ہو گیا تھا۔ ثمینہ چیخ مارتے ہی دھڑام سے اس شخص پر گر
پڑی اور بے ہوش ہو گئی — شامی پھٹی پھٹی آنکھوں سے فرش پر پڑے
آدمی کو دیکھتا رہا، پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا:
"میرے مالک، یہ انہیں کیا ہو گیا ہے؟"
محمود اور فاروق نے بے بسی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا،
پھر انہوں نے ثمینہ کو اٹھا کر بستر پر لٹا دیا اور روتے ہوئے آدمی کی طرف

مڑے — یہ ادھیڑ عمر کا تھا۔
"یہ کون ہیں، انہیں کیا ہوا ہے؟"
"یہ عدنان حارث ہیں، میرے مالک — یہ ان کی بیٹی ثمینہ ہیں،
انہیں کیا ہوا ہے، میں کچھ نہیں جانتا۔ مجھے تو ثمینہ بی بی باورچی خانے
سے بلا کر لائی تھیں۔" اس نے کہا اور ہچکیاں لینے لگا۔
محمود نے جھک کر عدنان حارث کی نبض پر ہاتھ رکھا، پھر دل
کی حرکت محسوس کرنے کی کوشش کی اور نفی میں سر ہلاتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔
"ان کے چہرے کو کیا ہوا — کیا ایسا ہی ہے؟" اس نے پوچھا۔
"کیا بات کرتے ہیں جی؟" وہ بولا۔
"فاروق، تم ثمینہ کو ہوش میں لانے کی کوشش کرو — میں پولیس
کو فون کرتا ہوں۔ خدا جانے کیا چکر ہے۔"
"ان چکروں کے سوا ہماری زندگی میں رکھا ہی کیا ہے۔" فاروق
بڑبڑایا اور ثمینہ کی طرف مڑ گیا۔ پہلے تو اس نے اسے ہلایا جلایا، پھر
گال تھپتھپائے اور آخر ملازم سے بولا:
"بھاگ کر پانی لاؤ۔"
"جی اچھا۔" شامی نے کہا اور دوڑتا ہوا چلا گیا — اس دوران
میں محمود فون پر پولیس سٹیشن کے نمبر گھماتا رہا، لیکن سلسلہ نہیں مل
رہا تھا۔ شامی پانی لے کر آیا تو فاروق نے ثمینہ کے منہ پر چھینٹے مارنا
شروع کیے — آخر اس نے آنکھیں کھول دیں — چند سیکنڈ تک وہ [illegible]

آنکھوں سے فاروق کو دیکھتی رہی اور پھر زور زور سے رونے لگی —
فاروق نے سوچا اسے کچھ دیر رو لینے دینا چاہیے — اسی وقت محمود
سلسلہ ملانے میں کامیاب ہو گیا:
"ہیلو، پولیس سٹیشن انھار آباد" ادھر سے کہا گیا۔
"عدنان عارف کی کوٹھی میں ایک حادثہ ہو گیا ہے — وہ پر اسرار
طریقے سے ہلاک ہو گئے ہیں، فوراً پہنچیے۔"
"آپ کون بول رہے ہیں؟"
"میرا نام محمود ہے" اس نے کہا۔
"کوٹھی کا پتا بتایئے" ادھر سے کہا گیا — محمود نے شامی سے
پوچھ کر کوٹھی کا نمبر بتا دیا۔
"ٹھیک ہے، ہم آرہے ہیں — کسی چیز کو ہاتھ نہ لگایا جائے۔"
ان الفاظ کے ساتھ ہی سلسلہ کٹ گیا —
"آپ کا کیا نام ہے؟" محمود نے ملازم سے پوچھا۔
"شامی"
"ہوں، آپ نیچے جا کر دروازے پر کھڑے ہو جایئے اور جونہی
پولیس آئے، انہیں اوپر لے آیئے۔"
"اچھا!" اس نے کہا اور چلا گیا۔
اب دونوں ثمینہ کی طرف متوجہ ہوئے۔
"آپ بتایئے کیا ہوا تھا؟"

"مجھے کچھ نہیں معلوم — میں اپنے کمرے کے غسل خانے میں نہا رہی
تھی کہ میں نے ڈیڈی کے چیخنے کی آواز سنی — میں دروازے پر پہنچی تو
اسے اندر سے بند پایا — میں نے چیخ کر پوچھا کہ کیا بات ہے ڈیڈی،
تو انہوں نے گھٹی گھٹی آواز میں صرف اتنا کہا — 'مجھے بچاؤ بیٹی،
مجھے بچاؤ — پھر بولے، مگر نہیں بیٹی تم اندر نہ آنا — ورنہ یہ تمہیں
بھی —' ان الفاظ کے بعد میں نے ان کی کوئی آواز نہ سنی۔ میں
بوکھلا گئی — دروازہ توڑنا میرے بس سے باہر تھا۔ بھاگ کر شامی کو
بلا لائی — شامی سے بھی دروازہ نہ ٹوٹا تو اس نے سڑک سے مدد
بلانے کے لیے کہا۔ میں دروازے پر پہنچ گئی اور آپ لوگوں کو آتے
دیکھا تو مدد کے لیے ہاتھ ہلا دیا — اس سے زیادہ میں کچھ نہیں جانتی
مگر میرے ڈیڈی کے چہرے کو کیا ہو گیا ہے — وہ — وہ ٹھیک تو ہو
جائیں گے نا" اس نے روتے ہوئے کہا۔
"ہمیں افسوس ہے، وہ آپ سے، اس دنیا سے روٹھ کر دوسری
دنیا میں چلے گئے ہیں" محمود نے رندھی ہوئی آواز میں کہا اور اس
کی آنکھوں میں بھی آنسو تیرنے لگے۔ ثمینہ نے ایک بار پھر دلدوز چیخ
ماری اور دھاڑیں مار کر رونے لگی — دونوں نے اسے چپ کرانے کی
بہتیری کوشش کی لیکن جب ناکام ہو کر رہ گئے تو اسے رو لینے دینا مناسب خیال کیا۔
"ثمینہ نے اپنے ڈیڈی کے جو آخری الفاظ سنے تھے اس سے
تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کمرے میں ان کے علاوہ بھی کوئی تھا — لیکن

کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ تو کیا وہ جو کوئی بھی تھا، کھڑکی کے ذریعے اندر آیا تھا۔" محمود نے سوچ میں گم لہجے میں کہا اور کھڑکیوں کی طرف بڑھا۔ دوسرے ہی لمحے ان دونوں کی نظریں ٹوٹے ہوئے شیشے پر پڑیں۔ شیشہ کھڑکی کے نیچے پڑا تھا، لیکن یہ تو ایک چھوٹا سا ٹکڑا تھا۔ دونوں کھڑکیوں کے باقی شیشے محفوظ تھے۔

"کمال ہے، اس ذرا سی جگہ سے تو کوئی اندر نہیں آ سکتا تھا، چٹخنیاں بھی ابھی تک لگی ہوئی ہیں۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ کوئی چٹخنی گرا کر اندر آیا ہو، پھر عدنان عارف کو ہلاک کرکے اس راستے سے چلا گیا ہو۔" اس نے پھر کہا اور نیچے دیکھنے کی کوشش کی، لیکن کھڑکیاں بند ہونے کی وجہ سے نیچے نہ دیکھ سکا۔ کھڑکیوں اور کسی دوسری چیز کو وہ ہاتھ نہیں لگا سکتے تھے۔

"ہو سکتا ہے، اس نے جاتے ہوئے چٹخنی لگا دی ہو تاکہ معاملہ پراسرار نظر آئے۔ یہ شیشہ اس نے چٹخنی گرانے کے لیے کھولا ہوگا۔" فاروق نے خیال ظاہر کیا۔

"بہت خوب، یہ بات بھی ممکن ہے۔ اس صورت میں چٹخنی پر اس کی انگلیوں کے نشانات ضرور ہوں گے، لیکن سوال یہ ہے کہ اس نے عدنان عارف کو کس طریقے سے ہلاک کیا۔ کیا یہ کوئی ز... تھا جس نے ان کے چہرے کو اس قدر پھلا دیا ہے۔"

"صرف چہرہ ہی نہیں، ہاتھ بھی پھول گئے ہیں۔" فاروق نے

ہاتھوں کی طرف اشارہ کیا۔

"ہاں، جب کہ باقی جسم بالکل نہیں پھولا۔ کیا خیال ہے، ابا جان کو فون نہ کیا جائے۔ معاملہ حد درجے پُراسرار ہے۔"

"خدا جانے وہ یہاں آنا پسند بھی کریں یا نہیں۔"

"بھئی اگر پسند نہیں کریں گے تو نہیں آئیں گے، ہم معاملہ پولیس کے سپرد کرکے واپس روانہ ہو جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے، تو پھر کر ڈالو فون۔"

محمود فون کی طرف مڑا ہی تھا کہ بھاری قدموں کی آواز گونجنے لگی۔ شاید پولیس آگئی تھی۔

پرانی عادت

پولیس والے دھڑ دھڑاتے ہوئے اندر داخل ہوئے — ان میں ایک سب انسپکٹر، ایک حوالدار اور تین کانسٹیبل تھے۔ نشانات وغیرہ لینے والے عملے کو شاید وہ اس لیے ساتھ نہیں لائے تھے کہ کہیں کسی نے مذاق نہ کیا ہو — شامی ان کے پیچھے تھا۔

"تم میں سے محمود کون ہے؟" سب انسپکٹر نے بارعب لہجے میں کہا۔

"میں ہوں۔" محمود نے آگے بڑھ کر کہا۔

"فون تم نے کیا تھا؟" اس نے پوچھا۔

"جی ہاں۔" محمود نے جواب دیا۔

"تو مسٹر عارف کو ہلاک کیا گیا ہے۔" یہ کہہ کر وہ فرش پر پڑی لاش کی طرف متوجہ ہوا، لیکن پھر زور سے اچھلا۔

"ارے، ان کے چہرے کو کیا ہو گیا ہے؟"

محمود نے جلدی جلدی اسے ساری تفصیل کہہ سنائی۔ ان سب کا مارے حیرت کے برا حال ہو گیا —

"تم نے کسی چیز کو ہاتھ تو نہیں لگایا؟"

"نہیں۔"

"بہت خوب، تب پھر پہلے انگلیوں کے نشانات وغیرہ اٹھوائے جائیں گے۔ لاش کی تصویریں لی جائیں گی — ہاں میں صرف ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں — ثمینہ صاحبہ، کیا کوئی ملاقاتی آپ کے کمرے میں موجود تھا؟"

"جی نہیں تو — کمرے کا دروازہ تو توڑا گیا ہے۔"

"وہ تو خیر ٹھیک ہے — میں نے سوچا، شاید وہ شخص کھڑکی کے ذریعے فرار ہوا ہو۔"

"بیرونی دروازہ بھی بند ملا تھا، جب میں نیچے مدد لینے کے لیے گئی۔" ثمینہ نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے، کوئی ملاقاتی نہیں آیا ہوا تھا۔"

"جی ہاں، ڈیڈی دفتر سے آکر کچھ دیر سونے کے عادی تھے — سونے کے بعد وہ غسل کیا کرتے تھے — یہی میرا بھی معمول ہے — میرا خیال ہے، وہ نہا کر نکلے ہوں گے کہ انہیں یہ حادثہ پیش آگیا۔" اس نے کہا۔

"ہوں، خیر ہم دیکھیں گے کہ کیا معاملہ ہے — آپ چاروں باہر برآمدے میں چلے جائیں — اور تم دونوں ابھی واپس نہیں جاؤ گے۔ تمہارا بیان لینا ہوگا۔"

"جی اچھا۔" محمود نے سعادت مندانہ لہجے میں کہا اور وہ چاروں

برآمدے میں آ گئے ۔۔۔ سب انسپکٹر فنگر پرنٹ کے عملے کو فون کرنے لگا۔

"ثمینہ صاحبہ، آپ کے ڈیڈی کیا کام کرتے تھے؟"

"وہ سرکاری ملازم تھے ۔ پلوں کی تعمیرات کے ٹھیکے دینا ان کی ذمے داری تھی۔"

"ان کا کوئی دشمن؟" فاروق نے سوالیہ لہجے میں کہا۔

"مجھے نہیں معلوم، لیکن وہ رشوت کے پیسے کو ہاتھ بھی نہیں لگاتے تھے ۔ ہو سکتا ہے، یہ کسی ایسے ٹھیکیدار کی حرکت ہو جسے ٹھیکہ نہ ملا ہو۔" اس نے کہا۔

"ہوں ۔۔۔ آپ کا خیال ٹھیک ہی لگتا ہے۔" فاروق بڑبڑایا۔

پولیس کی کارروائی مکمل ہونے میں ایک گھنٹہ لگ گیا۔ پولیس کے آ جانے کی وجہ سے محمود اپنے والد کو فون نہیں کر سکا تھا۔ اس کے بعد بھی اس نے کوشش کی تھی، لیکن اسے اجازت نہیں دی گئی۔ آخر دونوں کا بیان ہوا اور انہیں جانے کی اجازت مل گئی۔ وہ ثمینہ اور شامی کے پاس سے گزرتے ہوئے رک گئے۔

"یہ ہمارا فون نمبر ہے۔ اگر کوئی پریشانی ہو تو ہمیں فون کر دیجیے گا، ہم حاضر ہو جائیں گے ۔ آپ کے عزیز اور رشتے دار تو ہوں گے۔"

"جی ہاں، میں ابھی اپنے چچا جان کو فون کر رہی ہوں۔ وہ اسی شہر میں رہتے ہیں۔"

"اور آپ کی امی؟"

"وہ تو عرصہ ہوا فوت ہو چکی ہیں۔"

"آپ کے چچا کا نام کیا ہے؟"

"سلمان عارف ۔ یہ بھی ٹھیکیدار ہیں۔"

"اوہ ۔۔۔" محمود اور فاروق کے منہ سے ایک ساتھ نکلا ۔

"کیوں، آپ چونک کیوں گئے؟" ثمینہ نے پوچھا۔

"آپ کے خیال میں کبھی ایسا تو نہیں ہوا کہ آپ کے چچا جان نے بھی کوئی ٹھیکہ لینے کی کوشش کی ہو اور ان کے بھائی نے انکار کر دیا ہو۔"

"شاید ایسا ہوا ہو، مجھے علم نہیں۔"

"اچھا، ہم چلتے ہیں ۔۔۔"

یہ کہہ کر وہ ان سے رخصت ہوئے ۔ کوٹھی سے باہر نکلتے ہی فاروق نے کہا:

"تو کیا چچا نے بھائی کی دولت اور کوٹھی پر قبضہ جمانے کے لیے یہ کام کیا ہے؟"

***

انسپکٹر جمشید بڑی بے قراری سے ٹہل رہے تھے۔ شام کی چائے

کب کی ٹھنڈی ہو چکی تھی — فرزانہ اور بیگم جمشید میز پر گم صم بیٹھی تھیں — محمود اور فاروق اس وقت تک پورا ایک گھنٹا لیٹ ہو چکے تھے۔ ایسا جب بھی کبھی ہوا تھا، کسی خاص وجہ سے ہوا تھا۔ بلا وجہ وہ لیٹ ہو بھی نہیں سکتے تھے —

"میرا خیال ہے، ان کی تلاش میں نکل پڑنا چاہیے۔" انسپکٹر جمشید نے ٹہلتے ٹہلتے کہا —

"ہوں ٹھیک ہے — امی جان کو یہیں چھوڑ دیتے ہیں۔" فرزانہ بولی۔

"آؤ پھر۔"

دونوں اٹھ کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھے ہی تھے کہ گھنٹی بجی — انداز محمود کا تھا —

"لیجیے، وہ آ گئے۔" فرزانہ نے برا سا منہ بنایا — انسپکٹر جمشید نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا — محمود اور فاروق ان کے چہروں پر ناگوار تاثر دیکھ کر گھبرا گئے۔

"ہمیں بہت افسوس ہے ابا جان، لیکن اس میں قصور ہمارا نہیں ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔ اندر آ جاؤ۔" انسپکٹر جمشید دھیرے سے مسکرائے۔

"تمہارا نہیں تو کیا تمہارے فرشتوں کا ہے۔" فرزانہ نے جل کر کہا۔

"فرشتوں کا بھی نہیں — یہ سارا کیا دھرا تو ستاروں کا ہے۔ آخر ہمارے ستارے اتنے چکر دار کیوں ہیں کہ آئے دن ہم کسی نہ کسی چکر کی

لپیٹ میں آتے رہتے ہیں۔" فاروق نے بے چارگی کے آثار چہرے پر طاری کرتے ہوئے کہا۔

"چھوڑو یہ، بتاؤ ہوا کیا ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ہونا کیا ہے، کوئی کیس کھڑا کر لائے ہوں گے۔" فرزانہ ترش سے بولی۔

"فرزانہ، تم بالکل غلط کہہ رہی ہو — ہم کیس کھڑا کر کے کبھی نہیں لائے، کیس تو ہمیں بیٹھے بٹھائے مل جاتے ہیں۔" محمود نے اسے گھورا۔

"تم نے بتایا نہیں۔"

"جی ہاں، ہم نے اس عقلمند سب انسپکٹر سے آپ کو فون کرنے کی اجازت مانگی تھی، لیکن اس نے فون کرنے ہی نہیں دیا، ورنہ آپ کو ایک گھنٹے تک پریشان نہ ہونا پڑتا۔"

"کیا تم نے اس سے میرا نام لے کر اجازت مانگی تھی؟"

"جی نہیں، ہم نے اپنا آپ ظاہر نہیں کیا تھا۔"

"تم نے اچھا کیا — اب جلدی جلدی بتاؤ کہ ہوا کیا؟"

محمود نے تفصیل سے ایک ایک بات بتا دی — انسپکٹر جمشید سن کر گہری سوچ میں ڈوب گئے — محمود کے خاموش ہوتے ہی فرزانہ بول پڑی۔

"بالکل سیدھا سادا کیس ہے — یہ تو اس کے بھائی نے یہ کام کیا ہے یا پھر کسی ایسے ٹھیکیدار نے، جسے کوئی ٹھیکہ نہیں ملا ہو گا۔" فرزانہ نے لاپروائی سے کہا —

"اگر یہ سیدھا سادا کیس ہے تو اس میں ہمارا کیا قصور، ہم نے کب کہا ہے کہ یہ ایک بہت پیچیدہ کیس ہے۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"تم نے باہر آ کر یہ دیکھا تھا کہ باہر سے کھڑکی تک پہنچنے کے امکانات ہیں یا نہیں۔" انسپکٹر جمشید نے ان کی باتوں پر دھیان دیے بغیر کہا۔

"جی ہم نے اوپر سے نیچے دیکھنے کی کوشش ضرور کی تھی، لیکن چونکہ کھڑکی بند تھی اور ہم اس پر ہاتھ نہیں لگا سکتے تھے، اس لیے نیچے نہیں دیکھ سکے۔ رخصت کے وقت چونکہ ہم بہت لیٹ ہو چکے تھے، اس لیے خیال نہیں رہا۔" محمود نے کہا۔

"حالانکہ جب یہ برآمدے میں کھڑے تھے اور پولیس اندر اپنی کارروائی مکمل کر رہی تھی، اس وقت یہ نیچے جھانک کر دیکھ سکتے تھے۔" فرزانہ نے جھلا کر کہا۔

"ہاں، یہ ان سے غلطی ہوئی، لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ چیز تو ہم اب بھی دیکھ سکتے ہیں۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"جی کیا مطلب؟" فرزانہ چونکی۔

"فرزانہ، یہ کیس مجھے بہت دلچسپ اور بہت پیچیدہ معلوم ہو رہا ہے اور میں اس سے الگ رہنا ہرگز پسند نہیں کروں گا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"اور جب دو مرتبہ نصیحت آ جائے تو ہمیں ہوشیار ہو جانا چاہیے۔"

فاروق شرارت بھرے لہجے میں بولا۔ فرزانہ کا منہ لٹک گیا، کیونکہ اس کا خیال تھا، اس کے والد اس کیس پر کوئی توجہ نہیں دیں گے۔

"آؤ چلیں۔" انسپکٹر جمشید اٹھتے ہوئے بولے۔

"ارے ارے، چائے تو پی لیں۔" بیگم جمشید نے بوکھلا کر کہا۔

"لیکن بیگم چائے تو ٹھنڈی ہو چکی ہے، مہربانی فرما کر تم دوبارہ چائے بنا لو — ہم ابھی آتے ہیں۔ زیادہ دیر نہیں لگے گی، بس جانے اور آنے کی کسر ہے۔"

"دھت تیرے کی۔" بیگم جمشید نے جھلا کر کہا اور محمود کے انداز میں ران پر ہاتھ بھی مارا۔

"مجھے اپنی یہ عادت اب پرانی پرانی سی لگنے لگی ہے۔" محمود کا لہجہ افسردہ تھا — وہ مسکرانے لگے — باہر آ کر جیپ میں بیٹھے اور افضل آباد کی طرف روانہ ہو گئے۔

صرف بیس منٹ بعد وہ عدنان عارف کی کوٹھی کے سامنے جیپ سے اتر رہے تھے — انسپکٹر جمشید نے باہر کھڑے کھڑے کھڑکیوں کا جائزہ لیا — کھڑکیوں کے نیچے کی زمین کو بغور دیکھا اور پھر بولے:

"وقت چونکہ دن کا تھا، اس لیے اس کا تو امکان ہی نہیں ہے کہ وہ کسی رسی کی سیڑھی کے ذریعے کھڑکی تک پہنچا ہوگا، لہٰذا مجھے اندر جا کر جائزہ لینا ہوگا۔"

"لیکن ابا جان، اس طرح چائے ایک بار پھر ٹھنڈی ہو جائے گی۔"

فرزانہ نے گویا یاد دلایا۔

"کوئی بات نہیں — آج ہم ٹھنڈی چائے ہی پی لیں گے" انہوں نے مسکرا کر کہا اور دروازے پر لگی گھنٹی کا بٹن دبا دیا — دروازہ شامی نے کھولا اور ان دونوں پر نظر پڑتے ہی چونک اٹھا۔

"اوہو، آپ"

"ہاں، یہ ہمارے والد ہیں اور یہ چھوٹی بہن، ثمینہ بہن کو بتا دیں، ہم آئے ہیں"

"آئیے آئیے — اندر تشریف لے چلیے — ثمینہ کے چچا بھی آ چکے ہیں"

"اوہو اچھا، سلمان عارف نام ہے نا ان کا" محمود نے کہا۔

"جی ہاں" اس نے کہا اور انہیں ڈرائنگ روم میں لے آیا۔ فوراً ہی ثمینہ ان کے پاس پہنچ گئی — اس کی آنکھیں سرخ تھیں —

"مجھے بہت افسوس ہے بیٹی، لیکن لکھے کو کون مٹا سکتا ہے۔ اگر آپ زحمت نہ محسوس کریں تو میں وہ کمرہ دیکھنا چاہتا ہوں، جس میں یہ واردات ہوئی"

"ضرور دیکھیے، لیکن بات کیا ہے، آپ اس کمرے کو کیوں دیکھنا چاہتے ہیں"

"اس حادثے نے مجھے حیرت میں ڈال دیا ہے — میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ یہ چکر کیا ہے اور اس واردات کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے"

"اچھا آئیے" ثمینہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔

کمرے سے باہر نکلے ہی تھے کہ دوسری طرف سے ایک نوجوان آدمی آتا نظر آیا — اس کے چہرے کے نقش و نگار بہت سخت تھے — اس کی آنکھوں میں غم کی جھلک تھی — آخر کو اس کا بڑا بھائی ہلاک ہو گیا تھا۔

"یہ میرے چچا سلمان عارف ہیں" ثمینہ نے انہیں بتایا اور پھر اپنے چچا سے بولی:

"چچا جان، یہ ہیں وہ مہربان لوگ جنہوں نے دروازہ توڑنے میں ہماری مدد کی تھی — اب ان کے والد اور بہن ساتھ آئے ہیں، ہمدردی کے طور پر"

"آپ لوگوں کا بہت بہت شکریہ" اس نے کہا۔

"ہمیں اس حادثے پر بہت رنج ہے — ہم ذرا اس کمرے کا جائزہ لینے جا رہے ہیں"

"جائزہ، کس قسم کا جائزہ؟" اس نے حیران ہو کر کہا۔

"یہ کہ آخر عدنان صاحب کو کس طرح ہلاک کیا گیا — ہمارا خیال ہے کہ اس کے لیے کوئی عجیب و غریب طریقہ اختیار کیا گیا ہے"

"ضرور دیکھیے، کہیے تو میں بھی ساتھ ہی چلوں"

"جی نہیں، آپ زحمت نہ کریں — ثمینہ بیٹی ہمیں کمرہ دکھا دیں گی"

وہ ثمینہ کے ساتھ عدنان عارف کے کمرے میں داخل ہوئے — کمرہ ابھی تک جوں کا توں پڑا تھا — لیکن لاش اٹھا لی گئی تھی اور پوسٹ مارٹم

کے لیے جا چکی تھی۔ پولیس چونکہ اپنی کارروائی مکمل کر چکی تھی۔ اس لیے اس
نے کمرے کو سیل نہیں کیا تھا۔ محمود اور فاروق تو پہلے ہی کمرے کا جائزہ
لے چکے تھے۔ اس لیے وہ بے خیالی میں ادھر ادھر نظریں گھمانے لگے۔
جیسے کہ انہیں امید ہو کوئی نئی بات معلوم نہیں ہو گی! البتہ فرزانہ
اور انسپکٹر جمشید بغور ایک ایک چیز کو دیکھ رہے تھے۔ اچانک انسپکٹر
جمشید بولے:

"اب میں یہ بات یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ کھڑکی کے ذریعے
کوئی انسان اس کمرے میں داخل نہیں ہوا تھا۔"

"جی! اگر کوئی اندر داخل نہیں ہوا تھا تو ڈیڈی یہ کیوں
چلاتے تھے۔ 'شیلہ بیٹی مجھے بچاؤ۔ لیکن نہیں۔ تم اندر نہ آنا'
ورنہ یہ تمہیں بھی۔ ان کے ان الفاظ سے تو صاف ظاہر ہے کہ اندر
کوئی موجود تھا۔"

"جی ہاں، وہ کوئی انسان نہیں ہو سکتا۔" انہوں نے کہا۔ اب محمود،
فاروق اور فرزانہ بھی ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"تو پھر آپ اتنے یقین سے کس طرح کہہ سکتے ہیں؟"

"ابھی میں نے صرف یہ کہا ہے کہ اس کھڑکی کے ذریعے کوئی اندر
داخل نہیں ہوا تھا، لیکن یہ تو ہو سکتا ہے کہ بیرونی دروازے سے کوئی
اندر آیا ہو اور سیڑھیاں چڑھ گیا ہو۔"

"جی نہیں، ڈیڈی جب دفتر سے آئے تو میں نے ہی دروازہ کھولا

تھا اور پھر اندر سے بند بھی کر دیا تھا۔ اس کے بعد میں نے اور ڈیڈی نے
دوپہر کا کھانا کھایا تھا۔ پھر وہ عادت کے مطابق سونے چلے گئے تھے۔
میں بھی سونے کے لیے لیٹ گئی تھی۔ لیکن مجھے نیند نہ آئی تو میں سکول
کا کام کرنے بیٹھ گئی۔ یہاں تک کہ ڈیڈی جاگ گئے۔ انہوں نے میرے
کمرے کے دروازے پر آ کر بتایا کہ وہ جاگ گئے ہیں اور اب غسل کرنے
جا رہے ہیں۔ شامی سے چائے بنانے کے لیے کہہ دو۔ یہ کہہ کر وہ پھر
اپنے کمرے میں چلے گئے۔ میں نے شامی سے چائے کے لیے کہا اور غسل
خانے میں چلی گئی۔ شامی کا کہنا بھی یہی ہے کہ اس نے کسی کے لیے
بیرونی دروازہ نہیں کھولا۔"

"اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ بیرونی دروازے اور کھڑکی کے
ذریعے کوئی آدمی اندر داخل نہیں ہوا۔ کیا کوٹھی میں کوئی اور ایسا
راستہ ہے جس سے کوئی اندر داخل ہو سکے۔"

"میرے خیال میں تو ایسا کوئی راستہ نہیں۔" اس نے کہا۔

"خیر، میں پھر اس کوٹھی پر ایک نظر ڈالوں گا۔" یہ کہہ کر وہ ایک
بار پھر کمرے کا جائزہ لینے لگے۔

"ابا جان، آپ نے یہ اندازہ کس طرح لگایا کہ کھڑکی کے ذریعے
کوئی شخص اندر داخل نہیں ہوا، جب کہ کھڑکی کا شیشہ ٹوٹا ہوا ہے۔"
فرزانہ نے سوال کیا۔

"بالکل سامنے کی بات ہے۔ ایک تو وقت شام کا تھا۔ ایسے میں

کوئی رسی کی سیڑھی وغیرہ لگا کر اوپر چڑھنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا، علاقہ کم آباد ضرور ہے، لیکن اتنا کم بھی نہیں کہ کوئی ادھر سے گزر ہی نہ سکے — دوسری اہم بات یہ ہے کہ شیشہ چوکھٹ کے نچلے حصے کے پاس سے ٹوٹا ہے — نیچے سے لمبے بازو والا آدمی بھی اس جگہ سے بازو داخل کر کے اوپر والی چٹخنی تک ہاتھ نہیں لے جا سکتا تھا، چٹخنی کھولنے کے لیے ہمیشہ اوپر سے شیشہ توڑا جاتا ہے نہ کہ نیچے سے۔"

"اوہ، واقعی — ہم نے اس پہلو پر دھیان ہی نہیں دیا۔" محمود کے منہ سے نکلا۔

"میں دھیان دینے لگا تھا، پھر نہ جانے کیوں دیتے دیتے رہ گیا۔" فاروق نے مسکرا کر کہا۔

"بس بس، رہنے دو۔" فرزانہ نے جھلا کر کہا۔

"حیرت ہے، آپ کے انداز سے تو ایسا لگتا ہے جیسے آپ کوئی سراغرساں ہوں۔" شمینہ نے انسپکٹر جمشید کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ مجھے ایک سراغرساں ہی سمجھیے۔" وہ مسکرائے۔

عین اسی وقت دروازے کی گھنٹی بجی — شمینہ بڑبڑائی۔

"یہ اس وقت کون آ گیا؟"

"کوئی عزیز ہی آیا ہوگا۔" فرزانہ بولی — اسی وقت قدموں کی چاپ سنائی دی اور شامی اندر داخل ہوا۔

"پولیس کے ایک ماہر کمرے کا معائنہ کرنے آئے ہیں۔" اس نے کہا۔

"لے آؤ انھیں بھی۔" شمینہ بولی۔

جلد ہی ایک لمبے قد کا آدمی اندر داخل ہوا — اس نے ڈاکٹروں والا لباس پہن رکھا تھا — آنکھوں پر چشمہ تھا — انھیں عینک کے شیشوں میں سے دیکھتے ہوئے اس نے کہا:

"مجھے ڈاکٹر جہاں زیب کہتے ہیں — یہ کیس انتہائی عجیب ثابت ہوا ہے — عدنان عارف کے چہرے اور ہاتھوں پر سیکڑوں شہد کی مکھیوں نے کاٹا ہے اور ان کے زہر نے ہی ان کا کام تمام کیا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ یہاں اتنی شہد کی مکھیاں کہاں سے آ گئیں — کیا یہاں آس پاس کسی درخت پر شہد کی مکھیوں کے چھتے ہیں، اگر ہیں... تو بھی یہ کس طرح سے ممکن ہے کہ اتنی بہت سی شہد کی مکھیوں نے حملہ کر دیا ہو۔" وہ سوچ میں گم لہجے میں کہتا چلا گیا۔

"شہد کی مکھیاں، اگر غصے میں آ جائیں تو مل کر حملہ کر سکتی ہیں، یہ عجیب بات نہیں — ہاں، یہ عجیب بات ضرور ہے کہ اتنی بہت سی مکھیاں کہاں سے آ گئیں — شمینہ بیٹی، آس پاس شہد کی مکھیوں کے چھتے تو نہیں ہیں؟" انسپکٹر جمشید شمینہ کی طرف مڑے۔

"میں نے تو کبھی یہاں کہیں ایک مکھی بھی شہد کی نہیں دیکھی۔"

"عجیب بات ہے۔" ڈاکٹر جہاں زیب بولا۔

"لیکن ڈاکٹر صاحب، سوال یہ ہے کہ آپ یہاں کیا دیکھنے آئے ہیں، کیا لاش کا پوسٹ مارٹم آپ کر رہے ہیں؟"

"ہاں، میری زندگی کا یہ عجیب ترین کیس تھا۔ اس لیے میں یہاں چلا آیا کہ دیکھوں تو سہی، شہد کی مکھیوں کا امکان بھی ہے یا نہیں۔"

"آپ کے خیال میں اگر عدنان عارف کو شہد کی مکھیوں نے نہیں کاٹا تو ان کے چہرے اور ہاتھوں پر اتنے ڈنک کیسے لگ گئے۔" انسپکٹر جمشید نے پوچھا۔

"یہی دیکھنے تو میں آیا تھا — میں چاہتا تھا کہ ان چھتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں، لیکن اس بچی کا کہنا ہے کہ یہاں آس پاس شہد کی مکھیوں کا کوئی چھتہ نہیں ہے۔"

"جی ہاں، بالکل نہیں ہے — میں شامی کو ساتھ لے کر آس پاس کی سیر کرنے روزانہ جاتی ہوں — ہم جنگل میں بھی جاتے رہتے ہیں۔"

"تب پھر یہ مسئلہ کس طرح حل ہوگا — پوسٹ مارٹم کی رپورٹ پر کون غور کرے گا۔"

"لیکن جناب، یہ آپ کا کام تو نہیں ہے۔ آپ کا کام تو اتنا ہے کہ پوسٹ مارٹم کریں اور رپورٹ لکھ دیں — باقی کام تفتیش کرنے والوں کا ہے۔" انسپکٹر جمشید نے انہیں ٹوکا۔

"آپ کون ہیں؟ ویسے آپ کی بات بالکل ٹھیک ہے۔"

"مجھے جمشید احمد کہتے ہیں۔" انھوں نے کہا۔

"اچھا تو میں چلتا ہوں — سمجھے کیا — میں تو رپورٹ لکھ دوں گا۔"

"آپ ہسپتال سے آئے ہیں؟" انسپکٹر جمشید نے پوچھا۔

"جی ہاں، خدا حافظ۔" اس نے اُٹھتے ہوئے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔

"مجھے اس آدمی پر شک ہے۔ محمود فاروق تم اس کا تعاقب کرو۔"

"جی بہتر۔" دونوں نے ایک ساتھ کہا اور سیڑھیوں کی طرف چلے گئے۔

"آپ نے ان کے کیا نام لیے؟" شمینہ نے چونک کر کہا۔

"محمود اور فاروق۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"اور آپ نے ڈاکٹر صاحب کو اپنا نام جمشید احمد بتایا تھا؟"

"ہاں، میرا یہی نام ہے۔"

"تب پھر ان کا نام ضرور فرزانہ ہوگا۔" اس نے کپکپاتی آواز میں کہا۔

"آپ کا خیال ٹھیک ہے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"ابا جان، مجھے اس کمرے میں ڈر لگ رہا ہے۔ جلدی یہاں سے نکل چلیے۔"

"ڈر لگ رہا ہے۔" انسپکٹر جمشید نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔ ایک لمحے کے لیے کمرے کی فضا کو بغور محسوس کیا اور پھر چلائے۔

"بھاگو۔"

فرزانہ کو خوف محسوس ہوا کہ کہیں شمینہ ڈر نہ جائے، چنانچہ اس نے اس کا ہاتھ پکڑا اور دوڑ پڑی۔ کمرے سے نکل کر وہ بے تحاشا انداز میں دوڑتے ہوئے سیڑھیاں اتر گئے۔

"اپنے چچا جان اور ملازم کو گھر سے باہر نکلنے کے لیے کہہ دیں جلدی۔" انسپکٹر جمشید چلائے۔

"انکل، شامی فوراً گھر سے باہر نکل آئیں، خطرہ ہے۔"

اس نے یہ الفاظ پوری قوت سے چلا کر کہے تھے۔ سلمان عارف بوکھلا کر اپنے کمرے سے نکل آئے۔ شامی باورچی خانے سے دوڑتا آیا۔ وہ بھی ان کے پیچھے دوڑتے ہوئے باہر نکل آئے۔ بیرونی دروازے سے نکلنے کے بعد بھی وہ نہیں رُکے اور کچھ دُور تک دوڑتے چلے گئے۔

"آخر ہوا کیا ہے؟"

"ہمارا خیال ہے کہ اندر بم رکھ دیا گیا ہے۔"

"بم۔" سلمان عارف نے بوکھلا کر کہا۔ "بھلا یہاں بم کون رکھے گا۔"

"جو لوگ عدنان صاحب کو پراسرار طریقے سے ختم کر سکتے ہیں، وہ بم بھی رکھ سکتے ہیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"لیکن آپ کو کس طرح معلوم ہوا کہ بم رکھ دیا گیا ہے۔ کیا آپ نے بم کو دیکھا ہے؟"

"اگر بم نظر آ گیا ہوتا تو پھر بھاگنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں اسے بے کار کر سکتا تھا، چونکہ بم کو تلاش کرنے میں خطرہ تھا۔ اس لیے ہم نے باہر نکل آنا ہی مناسب خیال کیا۔"

"میرا خیال ہے، آپ کو ضرور وہم ہو گیا ہے۔"

"لیکن انکل، انہیں وہم نہیں ہو سکتا۔" فرزانہ بولی۔

"کیوں، یہ تم کس طرح کہہ سکتی ہو۔" سلمان عارف نے اسے گھورا۔

"اس لیے کہہ سکتی ہوں کہ یہ لوگ عام انسان نہیں ہیں۔ ایسے کاموں کا انہیں رات دن کا تجربہ ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"یہ انسپکٹر جمشید اور ان کی بیٹی فرزانہ ہیں۔ محمود اور فاروق تھوڑی دیر پہلے ہمارے ہاں آنے والے ڈاکٹر کا تعاقب کرنے گئے ہیں۔"

"ارے، وہ کیوں؟" اس نے حیران ہو کر کہا۔

"مجھے اس پر شک ہوا تھا اور اب تو یقین ہو چلا ہے کہ وہ دراصل کمرے میں بم رکھنے آیا تھا، ورنہ اس کے آنے سے پہلے ہم نے یہ محسوس نہیں کیا کہ کمرے میں بم موجود ہے۔" انسپکٹر جمشید نے کہا۔

عین اسی وقت کان پھاڑ دینے والا دھماکا ہوا۔

محمود کی تلاش

محمود اور فاروق کوٹھی سے باہر نکلے تو ایک سفید رنگ کی کار انہیں دُور سڑک پر جاتی نظر آئی۔ اب وہ جیپ میں ہی اس کا تعاقب کر سکتے تھے؛ چنانچہ محمود اچک کر اس میں بیٹھ گیا۔ فاروق نے ساتھ والی سیٹ سنبھال لی۔ جلد ہی جیپ اُڑی جا رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ کار سے مناسب فاصلے پر پہنچ گئے۔

"فرض کیا یہ شخص ہسپتال کا ڈاکٹر ثابت نہیں ہوا تو ہم کیا کریں گے۔" محمود نے فاروق کو خاموش پا کر کہا۔

"تم نے میرے سارے خیالات درہم برہم کر دیے۔ میں زندگی میں پہلی مرتبہ کسی کیس پر انتہائی سنجیدگی سے اور گہرائی سے غور کر رہا تھا۔" فاروق نے بُرا سا منہ بنایا۔

"اب مجھے کیا معلوم تھا کہ زندگی میں پہلی بار تم پر سنجیدگی سوار ہوئی ہے۔ خیر، تم پھر سے سوچ کے سمندر میں اتر جاؤ۔"

"اب میں کیا خاک اتروں گا۔ ہاں، تم کیا کہہ رہے تھے؟" فاروق نے منہ بنا کر کہا۔ محمود نے اپنی بات دہرا دی۔

"کرنا کیا ہے۔ اس کا ٹھکانا دیکھ کر واپس لوٹ چلیں گے۔"

"لیکن میں تو اس کے گھر میں داخل ہو کر یہ دیکھنا پسند کروں گا کہ وہ اندر جا کر کیا کرتا ہے؟"

"تب پھر تم ایسا کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ، کیونکہ ہسپتال دوسری سڑک پر رہ گیا ہے۔ یہ اب اور ہی سمت میں جا رہا ہے۔" فاروق بولا۔

"ہوں، تمہارا خیال ٹھیک ہے۔ اچھا سنو، ایسا کریں گے کہ میں تو اس کے گھر کے اندر داخل ہونے کی کوشش کروں گا اور تم واپس جا کر ابا جان کو اطلاع دے دینا۔ پھر وہ جو مناسب سمجھیں گے کر لیں گے۔"

"شاید انہیں تمہارا یہ اقدام پسند نہ آئے۔ انہوں نے ہمیں صرف تعاقب کرنے کے لیے کہا تھا۔"

"بھئی، ہمیں اپنی عقل بھی استعمال کرنی چاہیے۔ کچھ کام اپنی مرضی سے بھی کرنے چاہئیں۔"

"اچھا۔ جیسے تمہاری مرضی، لیکن تم ابا جان کو یہ ضرور بتا دینا کہ میں نے تمہیں ایسا کرنے سے منع ضرور کیا تھا۔" فاروق نے جل بھن کر کہا۔

"اچھا بتا دوں گا۔" محمود مسکرایا۔

اسی وقت انہوں نے سفید کار کو ایک کوٹھی کے سامنے رکتے دیکھا۔ انہوں نے جیپ کسی قدر فاصلے پر روک لی۔ محمود اترتے ہوئے بولا:

"کوٹھی ذہن نشین کر لو۔ بھول نہ جانا۔ میں خدا کا نام لے کر اندر جاتا ہوں۔"

"اچھا، اور میں خدا کا نام لے کر واپس جاتا ہوں۔ میری دعا ہے کہ تم ہر مصیبت سے محفوظ رہو، حالانکہ میں جانتا ہوں۔ تم خود مصیبت مول لے رہے ہو اور خود مول لی ہوئی چیز سے آدمی کس طرح محفوظ رہ سکتا ہے، لو میں چلا۔" یہ کہہ کر اس نے جیپ موڑ لی اور واپس روانہ ہو گیا۔ محمود پیدل اس کوٹھی کی طرف بڑھنے لگا جس میں سفید کار داخل ہوئی تھی۔ قریب پہنچ کر اس نے دیکھا، سفید کار پھاٹک کے اندر روک دی گئی ہے۔ پھاٹک کو کھلا چھوڑ دیا گیا تھا۔ محمود نے ادھر ادھر دیکھا، کوئی نظر نہ آیا۔ آخر وہ اندر داخل ہو گیا اور تیر کی طرح برآمدے کی طرف بڑھا۔ آواز پیدا کیے بغیر اس نے برآمدہ طے کیا، برآمدے کے اختتام پر ایک دروازہ نظر آیا۔ اس نے دباؤ ڈالا تو دروازہ کھلتا چلا گیا۔ یہ کسی کمرے کا دروازہ نہیں تھا بلکہ ایک تنگ سی گلی تھی۔ اس گلی کے دائیں طرف ایک کمرہ ڈرائنگ روم کی طرح سجا تھا۔ بائیں طرف ایک اور کمرے کا دروازہ تھا اور ایک دروازہ سامنے بھی تھا۔ ڈرائنگ روم میں کوئی نہیں تھا۔ دوسرے کمرے میں بھی کوئی نظر

نہ آیا۔ البتہ سامنے والے کمرے سے اسے باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔

"میں وہاں کام دکھا آیا ہوں، لیکن کام نمبر دو دکھانا پڑا۔ نمبر ایک کا موقع نہیں مل سکا۔" اس نے جہاں زیب کی آواز سنی۔

"اس کا مطلب ہے، وہ عمارت اس وقت تک ملبے کا ڈھیر بن چکی ہوگی اور اس میں رہنے والے ملبے کے ڈھیر میں دفن ہو چکے ہوں گے۔" دوسری آواز سنائی دی۔

"بالکل، اس میں اب کوئی شک نہیں رہا۔" جہاں زیب نے کہا۔

"اوہ!" محمود کے منہ سے خوف زدہ انداز میں یہ سوچے سمجھے بغیر نکل گیا کہ وہ اس وقت کہاں کھڑا ہے۔

"ہائیں، یہ اوہ کس نے کہا؟" جہاں زیب نے حیران ہو کر کہا۔

"کم از کم میں نے تو نہیں کہا۔" دوسری آواز نے کہا۔

محمود کو شدید خطرے کا احساس ہوا۔ وہ فوراً مڑا، لیکن ساتھ ہی اس نے ایک کڑکتی آواز سنی:

"خبردار، ایک قدم بھی اب نہ اٹھانا۔"

اس نے مڑ کر دیکھا۔ ڈاکٹر جہاں زیب پستول ہاتھ میں لیے اُسے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہا تھا۔

* * *

گرد کے بادل چھٹنے کے بعد انہوں نے دیکھا، پوری کوٹھی غائب ہو

گئی تھی — البتہ اس کی جگہ ملبے کا ایک بہت بڑا ڈھیر ضرور موجود تھا۔

"اف خدا، اگر ہم کوٹھی سے باہر نہ نکل گئے ہوتے تو اس وقت!"

سلمان عارف اس کے آگے کچھ نہ کہہ سکا۔

آس پاس کی کوٹھیوں والے دوڑتے ہوئے اس طرف آنے لگے۔

کسی نے پولیس کو بھی فون کر دیا — تھوڑی دیر بعد پولیس اور فائر بریگیڈ والے بھی آ گئے۔ لیکن وہاں کیا بچا تھا — پولیس اور فائر بریگیڈ والوں کے لیے یہ بات اطمینان کا باعث تھی کہ ملبے تلے کوئی شخص نہیں رہا تھا — انہوں نے اطمینان کا سانس لیا، کیونکہ دوسری صورت میں انہیں سارے ملبے کو چھاننا پڑتا — پولیس نے ان کے بیانات لیے اور پھر انہیں جانے کی اجازت مل گئی۔

"میں ڈیڈی کو اپنے ساتھ لے جاتا ہوں اور شامی کو بھی۔"

"ٹھیک ہے۔ آپ اپنا پتا مجھے بھی لکھوا دیں تاکہ کوئی ضرورت پیش آ جائے تو آپ سے ملاقات کی جا سکے۔"

"جی ہاں ضرور، میں ایبروڈی روڈ پر کوٹھی نمبر تین سو بارہ میں رہتا ہوں" سلمان عارف نے کہا

انہوں نے پتا نوٹ کیا اور وہ دونوں کو لے کر چلا گیا — اس کی کار بچ گئی تھی، کیونکہ باہر ہی کھڑی کر دی تھی۔

"اب ہم سب واپس چلیں گے" انسپکٹر جمشید بولے۔

"لیکن ابا جان، محمود اور فاروق تو یہیں واپس آئیں گے، بلکہ صرف

فاروق، محمود اس کے ساتھ کہاں آئے گا؟" فرزانہ بولی۔

"ہاں، تم ٹھیک کہتی ہو — محمود کی طبیعت ایسی کہاں کہ وہ ڈاکٹر جمال زیب کے گھر میں داخل ہوئے بغیر لوٹ آئے — خیر، ہم فاروق کا یہیں انتظار کریں گے" انہوں نے کہا۔

پڑوسی ان سے بار بار پوچھ رہے تھے، کیا ہوا تھا جناب — یہ کیسے ہوا۔ عدنان عارف کے بارے میں کیا معلوم ہوا، وہ کس طرح ہلاک ہوئے — اب وہ انہیں کیا بتاتے۔ گول مول جواب دیتے رہے۔ آخر جیپ آتی نظر آئی —

"یہ لیجیے، میرا اندازہ درست تھا — فاروق تنہا ہی آیا ہے" فرزانہ مسکرائی۔

فاروق نے قریب آ کر جیپ روک دی — ملبے کو دیکھ کر اس کے چہرے پر حیرت کے آثار ظاہر ہوئے تو فرزانہ بولی:

"ہم بھی بال بال بچے ہیں۔ بس خدا کو زندگی منظور تھی، ورنہ اس وقت تم ہماری قبروں پر فاتحہ پڑھ رہے تھے — آٹو میٹک قبروں پر"

فرزانہ نے مسکرا کر کہا —

"آٹو میٹک قبریں" فاروق کے منہ سے نکلا۔

"ارے بھئی، تم بتا دو کیا رہا — ڈاکٹر جمال زیب کو کہاں چھوڑ آئے، محمود تو ظاہر ہے وہیں ہوگا۔"

"ڈاکٹر جمال زیب یہاں سے ہسپتال نہیں گیا۔ وہ برج روڈ

کی ایک کوٹھی میں داخل ہو گیا تھا۔ محمود نے اندر داخل ہوئے بغیر لوٹنا پسند نہیں کیا؛ چنانچہ میں چلا آیا۔" اس نے کہا۔

"اور تم اسے مصیبت میں چھوڑ آئے؟"

"یہاں آکر اطلاع دینا بھی تو ضروری تھا، ورنہ اباجان کو کس طرح معلوم ہوتا کہ ہم کہاں ہیں۔" فاروق نے کہا۔

"تم نے اچھا کیا فاروق۔ محمود کی یہ عادت مجھے پسند نہیں، لیکن اکثر اوقات اس کی اس عادت سے بہت فائدہ ہوا ہے۔ خیر اب ہم گھر چلیں گے اور وہیں محمود کا انتظار کریں گے۔"

بیس منٹ بعد انہوں نے دروازے کی گھنٹی بجائی تو بیگم جمشید کا تملایا ہوا چہرہ دکھائی دیا۔ اس وقت انہیں یاد آیا کہ وہ تو انہیں چائے گرم کر کے رکھنے کا کہہ کر گئے تھے۔

"اوہو چائے تو ایک بار پھر ٹھنڈی ہو گئی ہو گی۔" انسپکٹر جمشید نے بوکھلا کر کہا۔

"اب تو آپ کھانے کی بات کیجیے۔" بیگم جمشید نے جھلا کر کہا۔

"ہائیں، تو کھانا بھی ٹھنڈا ہو گیا ہے۔"

"اور محمود کہاں ہے؟"

"اس نے کہلوا بھیجا ہے کہ کھانا ٹھنڈا ہی کھائے گا۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"اللہ رحم کرے۔" بیگم جمشید نے پاؤں پٹخ کر کہا اور اندر کی

طرف مڑ گئیں۔

"لیکن بیگم اللہ سے رحم مانگنے کا یہ کونسا طریقہ ہے۔ پیر پٹختے ہوئے بھی بھلا کہیں رحم ملتا ہے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

کھانے کے وقت تک بھی محمود نہ آیا تو انسپکٹر جمشید کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ فاروق، فرزانہ اور بیگم جمشید فکرمند ہو گئے۔

میرا خیال ہے بیگم، آج ہمیں کھانا بھی دوبارہ گرم کرنا پڑے گا۔ کیونکہ محمود کے بغیر کھانا ہمیں اچھا نہیں لگے گا؛ لہٰذا ہمیں اسے لینے کے لیے جانا ہی ہو گا۔"

"اچھی بات ہے۔ جا کر محمود کو لے آئیے۔ اس کے بغیر تو کھانا میں بھی نہیں کھاؤں گی۔ لیکن کھانا آج سب ٹھنڈا ہی کھائیں گے۔"

"لیکن بیگم، یہ تو سوچو، سردی شدت کی ہے۔ کھانا تو بالکل برف معلوم ہو گا۔"

"تو کیا ہوا۔ لوگ دسمبر میں آئس کریم کھا لیتے ہیں۔" انہوں نے بھی فوراً جواب دیا۔

"ہاں، یہ بھی ٹھیک ہے۔" انسپکٹر جمشید نے کہا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

"آؤ بھئی فاروق، ہم دونوں چلتے ہیں۔"

"اباجان، کیا آپ مجھے ساتھ لے جانا پسند نہیں کریں گے۔" فرزانہ نے شکایت بھرے لہجے میں کہا۔

"اگر تم چلنا پسند کرو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میں نے تو اس

لیے نہیں کہا تھا کہ وہاں کوئی خاص کام تو ہے نہیں — بس ہمیں یہ دیکھنا
ہے کہ محمود اس کوٹھی میں داخل ہوا تھا تو اس پر کیا گزری اور وہ
واپس کیوں نہیں پہنچا — خیر، آؤ تم بھی آؤ۔"

"ہاں جاؤ، تم بھی جاؤ۔" بیگم جمشید نے بڑی بوڑھیوں کے انداز میں
جل بھن کر کہا — اور وہ مسکراتے ہوئے نکل گئے۔

فاروق نے نزدیک پہنچنے پر اس کوٹھی کی طرف اشارہ کیا جس میں
ڈاکٹر جہاں زیب داخل ہوا تھا — وہ جیپ کوٹھی کے بالکل سامنے لے
گئے — محمود نے دروازے کی گھنٹی کے بٹن پر ہاتھ رکھ دیا — جلد ہی
قدموں کی چاپ سنائی دی اور سفید ڈاڑھی والے ایک بوڑھے کی شکل
دکھائی دی —

"جی فرمائیے۔" اس نے کہا۔

"ہمیں ڈاکٹر جہاں زیب سے ملنا ہے۔"

"ڈاکٹر جہاں زیب — وہ تو جا چکے ہیں۔"

"جا چکے ہیں، کیا مطلب؟"

"وہ میرے ہاں مہمان ٹھہرے ہوئے تھے — آج تھوڑی دیر پہلے
چلے گئے۔"

"لیکن وہ کب سے آپ کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے — کیا وہ آپ
کے دوست ہیں؟"

"جی نہیں، میں مہمانوں کو ٹھہرانے کے سلسلے میں بہت مشہور ہوں۔

لوگ اکثر میرے ہاں آ کر مہمان ٹھہرتے ہیں۔ دو چار دن ٹھہر کر چلے جاتے
ہیں، عام طور پر دوسرے شہر سے آنے والے لوگ میرے ہاں ٹھہر جاتے
ہیں — ڈاکٹر جہاں زیب بھی تین روز پہلے یہاں آ کر ٹھہرا تھا۔ آج وہ چلا
گیا۔"

"اوہ، کچھ دیر پہلے جب ڈاکٹر جہاں زیب کہیں باہر سے آیا تھا،
تو کیا اس وقت آپ گھر میں ہی تھے؟"

"جی ہاں، دراصل میں اپنی بیٹی کے ساتھ اوپر والی منزل میں
رہتا ہوں — نچلی منزل میں نے خلق خدا کے لیے وقف کر رکھی ہے —
کوئی آئے، کوئی جائے — میرا نظریہ ہے، اگر کوئی چیز میری ضرورت
سے زائد ہے تو وہ دوسروں کے کام آنی چاہیے، لہٰذا میرے مکان کی
نچلی منزل ایک قسم کا مسافر خانہ ہے جس سے میں کوئی غرض نہیں
رکھتا۔"

"لیکن اس طرح تو آپ کے مکان پر کوئی قبضہ کر سکتا ہے، میرا
مطلب ہے، نچلی منزل پر۔"

"جی نہیں، میں نے اس کام کے لیے باقاعدہ ایک ملازم رکھا
ہوا ہے، وہ آنے والوں کے نام اور پتے درج کرتا ہے اور ان سے
رجسٹر پر دستخط بھی لیتا ہے کہ وہ بطور مہمان اتنے دن کے لیے ٹھہرنے
آئے ہیں۔"

"آپ جیسے نیک آدمی آج کی دنیا میں بہت کم ہوں گے — خیر،

سوال یہ ہے کہ گھنٹی بجانے پر آپ دروازے پر کس طرح آ گئے، جب کہ آپ اوپر والی منزل پر رہتے ہیں — کم از کم آپ کے ملازم کو آنا چاہیے تھا۔"

"اس وقت میں اتفاق سے نچلی منزل کا جائزہ لینے اترا تھا۔ میں یہ بھی تو دیکھتا ہوں کہ مہمانوں کو کوئی تکلیف تو نہیں۔ ان میں سے کوئی دوسرے سے زیادتی تو نہیں کر رہا۔"

"بہت خوب، آپ نے اب تک اپنا نام نہیں بتایا۔"

"مجھے پروفیسر ڈی ٹی داؤ کہتے ہیں۔"

"اور آپ کرتے کیا ہیں؟"

"ارے آپ نے میرا نام نہیں سنا — میں اس ملک کا مشہور سائنسدان ہوں۔ ایک روز میں ملک کو ایک بہت عظیم ایجاد دوں گا۔"

اس نے فخریہ لہجے میں کہا۔

اب انسپکٹر جمشید کو یاد آیا۔ انھوں نے پروفیسر ڈی ٹی داؤ کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا، لیکن عام طور پر کہا جاتا تھا کہ وہ ایک پاگل سائنس دان ہے — اس کے پاس باپ دادا کے زمانے کی جائیداد بے تحاشا ہے۔ اس کی آمدنی پر عیش کر رہا ہے اور اوٹ پٹانگ تجربے کرتا رہتا ہے — مہمانوں کو ٹھہرانے کے بارے میں وہ مشہور تھا — اب انہیں اس کی باتوں پر یقین آ گیا — وہ جلدی سے بولے:

"اوہ پروفیسر صاحب، میں معافی چاہتا ہوں۔ میں نے آپ کا بہت چرچا سنا ہے، لیکن ذہن سے نام اترا ہوا تھا — اب سنیے، آپ کے مہمان ڈاکٹر جہاں زیب ایک کوٹھی کو ڈائنامیٹ سے اڑانے کے جرم میں پولیس کو مطلوب ہیں — ہم انہیں تلاش کرتے کرتے یہاں تک آئے تھے، لیکن اب آپ کہتے ہیں، وہ جا چکے ہیں — کیا آپ ہمیں ان کا کمرہ دیکھنے کی اجازت دیں گے؟"

"جی ہاں، ضرور — کیوں نہیں۔ کیا آپ کا تعلق پولیس سے ہے؟"

"جی ہاں، یہی سمجھ لیں۔"

"اندر تشریف لے آئیے — ملازم اس وقت اپنے گھر کھانا کھانے چلا جاتا ہے — میں اپنی بیٹی کے ہاتھ کا تیار کیا ہوا کھانا کھاتا ہوں، مہمان جو یہاں ٹھہرتے ہیں، ہوٹل سے منگوا کر کھا لیتے ہیں۔"

وہ برآمدے میں چلنے لگے — برآمدے کے اختتام پر ایک دروازہ تھا پروفیسر ڈی۔ ٹی داؤ نے دروازہ دھکیلا اور اندر داخل ہو گیا — انھوں نے خود کو ایک پتلی سی گلی میں پایا —

"دائیں طرف والا کمرہ مہمانوں کے لیے ڈرائنگ روم کا کام دیتا ہے۔ یعنی اگر کوئی ان سے ملنے کے لیے آ جائے تو وہ اسی کمرے میں ان سے ملاقات کرتا ہے — بائیں طرف ایک کمرے کا دروازہ کھلتا ہے ایک کمرہ سامنے ہے، دو کمرے ان کے دوسری طرف ہیں — یہ چار کمرے مہمانوں کے لیے ہیں — ان میں کم از کم آٹھ آدمی ٹھہر سکتے ہیں۔"

ڈاکٹر جہاں زیب اپنے ایک ساتھی کے ساتھ سامنے والے کمرے میں ٹھہرا ہوا تھا۔ ان دنوں اتفاق سے اور کوئی مہمان یہاں نہیں ہے۔"

"بہت خوب، تو ہم سامنے دوسرے کمرے میں چلیے۔"

وہ اس کمرے میں داخل ہوئے۔ کمرہ خالی پڑا تھا۔ کمرے کے فرش پر البتہ کچھ جوتوں کے نشان تھے۔ کمرے کی چھت کے ساتھ ایک چھوٹی سی گیلری بھی تھی۔

"ابا جان، یہ جوتے کا نشان ضرور محمود کا ہے۔"

"ہوں، ذرا میں یہ گیلری دیکھ لوں۔" انسپکٹر جمشید نے کہا اور لکڑی کی سیڑھی پر چڑھنے لگے۔ جوں ہی انہوں نے اوپر والے ڈنڈے پر قدم رکھا، ان کے منہ سے نکلا:

"ارے، محمود تم یہاں موجود ہو؟"

بیگم جمشید کی مصیبت

"لیکن ابا جان، یہ حضرت اوپر کیا کر رہے ہیں۔" فرزانہ نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔ ادھر پروفیسر ڈی ٹی راؤ کا بُرا حال تھا۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ کیا گیلری میں کوئی موجود ہے؟"

"جی ہاں، میرا بیٹا۔ ہم اسی کی تلاش میں ڈاکٹر جہاں زیب کے پیچھے آئے تھے۔" انسپکٹر جمشید نے کہا اور اوپر چڑھ گئے۔

"اف میرے خدا، یہ کیا ہو رہا ہے۔" پروفیسر راؤ کے منہ سے خوف زدہ انداز میں نکلا۔

اتنی دیر میں انسپکٹر جمشید محمود کو کندھے پر سوار کر چکے تھے۔ تھوڑی دیر بعد محمود ایک پلنگ پر ان کے سامنے پڑا تھا، اس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے اور منہ میں کپڑا ٹھونس کر رومال باندھ دیا گیا تھا۔ انسپکٹر جمشید اسے جلدی جلدی کھولنے لگے۔ محمود ہوش میں تھا۔ منہ کھلتے ہی بولا:

"خدایا تیرا شکر ہے۔"

"میں نے تمہیں منع کیا تھا نا، لیکن تم مانے نہیں۔"

"یہ میری پرانی عادت ہے۔"

"یہ بتاؤ، ہوا کیا تھا۔"

"بس، میں کوٹھی میں گھس گیا۔ دروازے مجھے کھلے ملے — آخر میں اس گلی تک پہنچ گیا — میں اس کمرے کے دروازے سے لگا ڈاکٹر جہاں زیب اور اس کے ساتھی کی باتیں سن رہا تھا کہ میرے منہ سے غیر ارادی طور پر اوہ نکل گیا۔ یہ آواز ان کے کانوں تک پہنچ گئی — میں نکلا جا رہا تھا کہ ڈاکٹر جہاں زیب نے پستول کے زور پر مجھے روک لیا — پھر کمرے میں لے آئے — میں نے پستول کی موجودگی میں جھگڑنا مناسب نہیں سمجھا — کیونکہ میں جانتا تھا، آپ مدد کو پہنچ جائیں گے۔ لہٰذا چپ چاپ خود کو بندھوا لیا۔" محمود کہتا چلا گیا —

"اور وہ کیا بات تھی جسے سن کر تم خود پر قابو نہیں رکھ سکے۔" انسپکٹر جمشید نے پوچھا۔

"ڈاکٹر جہاں زیب نے کہا تھا، میں وہاں کام دکھا آیا ہوں لیکن کام نمبر ایک نہیں دکھا سکا، نمبر دو دکھا آیا ہوں — اس پر اس کے ساتھی نے کہا تھا کہ اس کا مطلب ہے — اب وہ کوٹھی ملبے کا ڈھیر بن چکی ہوگی — یہ سن کر میں بوکھلا گیا اور میرے منہ سے اوہ نکل گیا —"

"کام نمبر ایک — کام نمبر دو۔" فرزانہ بڑبڑائی —

"ہاں بالکل یہی الفاظ اس نے کہے تھے۔"

"سوال یہ ہے کہ وہ کام نمبر ایک کیا تھا جو ڈاکٹر جہاں زیب نہیں دکھا سکا۔" فرزانہ نے سوچ میں گم لہجے میں کہا۔

"ذہنوں پر زور دو — یہ معاملہ ہر آن دلچسپ تر ہوتا جا رہا ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے —

"کچھ مجھے بھی بتا دیں، یہ کیا معاملہ ہے۔" پروفیسر نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔

"ڈیڈی آپ کہاں ہیں؟" ایک چہکتی ہوئی آواز آئی اور پھر ایک نوجوان لڑکی تیز تیز چلتی اندر داخل ہوئی۔ اس نے ایک نظر سب پر ڈالی اور پھر بولی:

"ڈیڈی، آپ پھر یہاں ہیں — آخر آپ اپنا قیمتی وقت کیوں ضائع کرتے ہیں — ان لوگوں کو آپ نے نچلی منزل دے دی ہے، یہی کیا کم ہے۔ اس پر ان کا حال احوال پوچھنے چلے آتے ہیں۔"

"یہ میری بیٹی ہما راؤ ہے، بس ذرا اس کے خیالات میرے خیالات سے نہیں ملتے — ہمیشہ ناک بھوں چڑھاتی رہتی ہے — اس کا کہنا ہے کہ ہم نچلی منزل کرائے پر بھی دے سکتے تھے — دو ہزار روپے ماہوار تو کہیں گئے نہیں، لیکن میں اپنی طبیعت کو کیا کروں جس میں دوسروں کی خدمت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہے — خیر تو بیٹی، یہ لوگ ہمارے مہمان نہیں ہیں۔ ان کا تعلق پولیس سے ہے۔"

"پولیس — لیکن پولیس کا ہمارے کیا کام؟"

"یہ تو خود ابھی تک میں بھی نہیں سمجھ سکا — ہاں تو جناب، آپ بتانا پسند کریں گے؟"

"جی ہاں، کیوں نہیں۔" انسپکٹر جمشید بولے اور پھر انہوں نے مختصر الفاظ میں یہاں تک آنے کی وجہ بتا دی — محمود کو بندھا ہوا پروفیسر اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔

"ہاں، یہ ٹھیک ہے۔ میں ان کے بیٹے کو بندھا ہوا دیکھ چکا ہوں۔" پروفیسر راؤ نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے — اس مرتبہ ہمارے ہاں کچھ غلط لوگ مہمان ٹھہر گئے تھے —" سیما نے پریشان ہو کر کہا۔

"ہاں، یہی بات ہے، لیکن اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں۔"

"بالکل ٹھیک پروفیسر صاحب — اچھا اب ہم چلتے ہیں، اگر ضرورت پڑی تو پھر حاضر ہوں گے۔" انسپکٹر جمشید دروازے کی طرف مڑتے ہوئے بو[لے]

"بھلا پھر کیا ضرورت پڑ سکتی ہے۔ ان مہمانوں سے ہمارا کوئی تعلق تو تھا نہیں جنہوں نے آپ کے بیٹے کو باندھ کر یہاں ڈال دیا او[ر] اس کو مٹی کو ڈائنا میٹ سے اڑا دیا۔"

"آپ کا کوئی قصور نہیں، لیکن ان لوگوں کے بارے میں اگر کچھ پوچھنا پڑے گا — تو ہم آپ کے پاس آ جائیں گے — مثلاً جمال زی[دی] کو تو خیر ہم دیکھ چکے ہیں۔ اس کے دوسرے ساتھی کا حلیہ کیا تھا؟"

"حلیہ آپ ہم سے ابھی پوچھ لیں۔" سیما نے جلدی سے کہا۔

"چلیے ٹھیک ہے، بتائیے حلیہ۔"

"وہ پتلا دبلا تھا اور اس کی ناک بالکل طوطے کی ناک ایسی [تھ]ی — پیشانی تنگ تھی — آنکھیں بالکل گول جیسی الوؤں کی ہوتی [ہ]یں۔" سیما راؤ نے مذاق اڑانے والے لہجے میں کہا۔

"کیا آپ ہم سے مذاق کر رہی ہیں۔"

"سیما دوسروں کا مذاق ضرور اڑاتی ہے، لیکن اس نے حلیہ غلط [ن]ہیں بتایا۔ آپ کے بیٹے نے بھی تو اسے دیکھا ہوگا — جاؤ بیٹی، انہیں [د]روازے تک رخصت کر آؤ۔"

"میں رخصت کر آؤں۔" اس نے ناک بھوں چڑھائی۔

"ہاں تم — میں بوڑھا آدمی ہوں اور زیادہ چل پھر نہیں سکتا۔" [پر]وفیسر راؤ نے سخت لہجے میں کہا۔ سیما سہم گئی، اس کی ساری شوخی [کا]فور ہو گئی — وہ ان کے ساتھ قدم اٹھاتے ہوئے بولی:

"چلیے جناب۔"

وہ اس کے ساتھ چلتے ہوئے دروازے تک آئے — جیپ میں [بیٹھ]تے ہوئے فاروق نے سیما سے پوچھا:

"آپ کا اپنے ڈیڈی کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"کیا مطلب؟" اس نے چونک کر کہا۔

"کیا وہ واقعی بہت بڑے سائنس داں ہیں اور ایک دن کوئی عظیم ایجاد قوم کے حوالے کریں گے؟"

"ان بے چاروں کو تو سائنس کی الف ب کا بھی نہیں پتا۔ ان کا اسسٹنٹ انہیں اُلّو بنا تا رہتا ہے" سیما نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔

"کیا مطلب؟" وہ چونکے۔

"انہوں نے ایک اسسٹنٹ بھی رکھا ہوا ہے۔ اس کا نام وکٹر مور ہے۔ ریکارڈ کے سلسلے میں وہ بے شمار چیزیں خرید کر لاتا رہتا ہے۔ ظاہر ہے، بیچ میں خود بھی کما لیتا ہوگا۔ بس ڈیڈی اس کے مشوروں پر عمل کرتے رہتے ہیں۔ جو تجربہ وہ کہتا ہے وہ کرتے چلے جاتے ہیں"

"پھر تو مسٹر وکٹر مور بہت دلچسپ شخصیت ہوئے، پھر کسی دن ان سے ملاقات کرنے ضرور آئیں گے۔ لیکن بیٹی آپ اپنے ڈیڈی کو کیوں نہیں سمجھاتیں"

"وہ مجھے ایک ننھی سی بچی سمجھتے ہیں اور ہاں، فی الحال آپ وکٹر سے ملنے بھی نہیں آ سکتے۔ وہ ان دنوں چھٹی پر ہے"

"ہوں، خیر ہم پروفیسر صاحب کو سمجھانے کی کوشش کریں گے" وہ بولے۔

"وہ نہیں سمجھیں گے۔ وہ اپنی دولت کو فضول قسم کے تجربات ضائع کرنے سے باز نہیں آئیں گے۔ انہیں اس کا جنون کی حد تک شوق ہے" سیما داؤ نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"اچھا خیر کچھ بھی ہو، ہم ایک بار ضرور یہاں آئیں گے"

یہ کہہ کر انہوں نے جیپ چلا دی۔ کچھ ہی دور جا کر وہ ایک ٹیلیفون بوتھ کے سامنے اترے اور فون کی اجازت لے کر پروفیسر داؤد کے نمبر ڈائل کیے۔

"ہیلو پروفیسر صاحب — یہ میں ہوں جمشید"

"بھول گئے، مجھے کیا۔ بلکہ شائستہ کو بھی کیا" دوسری طرف سے ناراضی ٹپک رہی تھی۔

"ارے ارے، یہ کیا۔ کیا آپ مجھ سے ناراض ہیں؟" انسپکٹر جمشید نے مصنوعی حیرت ظاہر کی۔

"نہیں بہت خوش ہوں، کیونکہ آج پورا ایک ماہ ہو چلا ہے تم سے ملاقات نہیں ہوئی، نہ بچوں کی شکل دیکھی ہے۔ کیا انہیں بھی ادھر آنے سے روک دیا ہے"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے پروفیسر صاحب، ہم بہت جلد آپ سے ملنے آئیں گے، فکر نہ کریں"

"جب آ جاؤ گے تو فکر کرنا چھوڑ دوں گا" پروفیسر داؤد نے مصنوعیت سے کہا اور انہیں ہنسی آ گئی۔

"آپ پروفیسر ڈی ڈی راؤ کو جانتے ہیں" انہوں نے مطلب کی بات پر آتے ہوئے کہا۔

"ہاں، کیوں کیا بات ہے؟"

"وہ کیسا آدمی ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

"بہت معقول آدمی ہے" پروفیسر داؤد نے جواب دیا۔

"کیا فرمایا، معقول آدمی ہے؟"

"ہاں، جو آدمی اپنی کوٹھی کی ایک منزل کو مسافر خانے میں تبدیل کر دے، تاکہ خلق خدا کو فائدہ پہنچے، وہ معقول آدمی نہیں ہوگا تو کیا ہوگا۔" انھوں نے جواب دیا۔

"آپ کی بات بالکل ٹھیک ہے، لیکن اس وقت میں اس کی سائنس کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔"

"وہ بہت پائے کا سائنس داں ہے۔"

"کیا آپ مذاق کے موڈ میں ہیں۔" انسپکٹر جمشید نے حیران ہو کر کہا۔

"نہیں تو، تم نے یہ اندازہ کس طرح لگایا!"

"اس طرح کہ لوگوں میں وہ پاگل سائنس داں مشہور ہے، خود اس کی بیٹی کا خیال یہ ہے کہ اسے سائنس کی الف ب بھی نہیں آتی۔"

"بھئی، میں اس سے مل چکا ہوں، بلکہ دو تین بار ملاقات ہو چکی ہے۔ وہ ہر لحاظ سے معقول آدمی ہے — اب تک کوئی کام کی چیز ایجاد نہیں کر سکا — اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ کوئی بہت ہی بڑی ایجاد کر کے پوری دنیا کو حیرت میں ڈال دینا چاہتا ہے۔"

"لیکن پروفیسر صاحب، اس کی اپنی بیٹی اسے پاگل کیوں کہتی ہے۔"

"نئی روشنی میں آنکھ کھولی ہے اس نے، کالج میں پڑھتی ہے، اپنے باپ کے بارے میں زیادہ تر اس نے دوسروں سے ہی سنا ہے۔ گھر کا تو کوئی آدمی بتانے سے رہا — وہاں ہے ہی کون۔ پروفیسر نے تو گھر کے کام

اج کے لیے کوئی ملازم تک نہیں رکھا۔ ان کی بیٹی کھانا تیار کر لیتی ہے۔ ہوٹل سے لے آتے ہیں — البتہ پروفیسر نے نچلی منزل میں ٹھہرنے والے مہمانوں کے لیے ضرور ایک ملازم رکھا ہوا ہے۔"

"تو آپ کے خیال میں وہ اچھا بھلا سائنس داں ہے۔"

"بالکل، اس میں کوئی شک نہیں۔" وہ بولے: "اگر اس میں یہ خبط نہ ہوتا کہ وہ صرف کوئی بڑی چیز ہی ایجاد کرے گا، تو اس وقت تک درجنوں چیزیں ایجاد کر چکا ہوتا۔ تجربات کے راستے میں جب وہ کوئی چھوٹی موٹی چیز دریافت کر بیٹھتا ہے تو اسے پرے جھٹک دیتا ہے اور یہ اس کی غلطی ہے۔"

"بہت خوب، آپ کی ان معلومات کے لیے شکریہ۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"لیکن بات کیا ہے — تم پروفیسر داؤ کے بارے میں اس قدر کرید کر سوالات کیوں کر رہے ہو۔" پروفیسر کے لہجے میں حیرت تھی۔

"ابھی میں خود بھی نہیں جانتا، لیکن ایک آدھ دن ٹھہر کر آپ کو ان سوالات کی وجہ بتا سکوں گا۔ — اچھا شکریہ۔"

"تو پھر تم لوگ کب آ رہے ہو؟"

"بہت جلد — شاید آج یا کل۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"یار کیوں مذاق کر رہے ہو۔"

"مذاق اور میں آپ سے کروں گا، خیر آپ کو معلوم ہو ہی جائے گا

گا کہ یہ مذاق نہیں ہے۔" پروفیسر داؤد کے ریسیور رکھتے ہی انھوں نے بھی ریسیور رکھ دیا اور گھر کی طرف چل پڑے۔

"بھئی محمود، آج تمہاری امی کا پارہ بہت چڑھا ہوا ہے اور ان کا پارہ چڑھانے میں کچھ تمہارا بھی ہاتھ ہے۔ ہم آج شام کی چائے نہیں پی سکے۔ جب کہ انھوں نے دو تین مرتبہ گرم بھی کی اور اب وہ کھانا بھی شاید دوبارہ گرم کر رہی ہوں گی۔ میرا خیال ہے ان کا سارا غصہ تم ہی سنبھالنا۔"

"جی بہتر۔" محمود نے مسمی صورت بنا کر کہا اور وہ مسکرانے لگے۔

گھر پہنچے تو بیگم جمشید کا غصہ واقعی آسمان سے باتیں کر رہا تھا۔ انھوں نے محمود کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھا اور کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ انھوں نے فوراً منہ فون کی طرف کر لیا اور اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھنے لگیں۔ انسپکٹر جمشید نے تیزی سے آگے بڑھ کر ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف سے ان کے آئی جی صاحب شیخ نثار احمد بول رہے تھے۔

"ہیلو جمشید، فوراً پروفیسر شامی کی کوٹھی پر پہنچو، انھیں تمہاری سخت ضرورت ہے۔ تینوں بچوں کو بھی ساتھ لے جاؤ۔"

"لیکن جناب ہوا کیا ہے؟"

"ان کی زندگی خطرے میں ہے۔" یہ کہتے ہوئے آئی جی صاحب نے ریسیور رکھ دیا۔ انسپکٹر جمشید بیگم کی طرف مڑے اور بولے:

"مجھے افسوس ہے بیگم، آج کا دن تمہارے لیے بہت منحوس ہے۔ کھانا بھی تم شاید دو مرتبہ گرم کر چکی ہو، لیکن نہایت افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ اس وقت بھی ہم کھانا نہیں کھا سکیں گے۔ آئی جی صاحب کا فون تھا، ہمیں اسی وقت ایک اور جگہ جانا ہے۔"

بیگم جمشید دھڑام سے ایک کرسی میں گر پڑیں۔ ان کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔

ڈاکٹر جہاں زیب

پروفیسر نامی پولی ٹیکنیک کالجوں کے ڈائریکٹر تھے ۔ آئی جی صاحب کے دوستوں میں سے تھے ۔ انسپکٹر جمشید کو ان کی کوٹھی کا پتا معلوم تھا، اس لیے وہاں تک پہنچنے میں کوئی دقت نہ ہوئی ۔ محمود نے آگے بڑھ کر گھنٹی کا بٹن دبایا ۔ فوراً ہی ایک ملازم نے دروازہ کھولا اور انہیں سیدھا پروفیسر نامی کے کمرے میں لے گیا ۔ پروفیسر اپنے بستر پر لیٹے تھے اور ان کے علاوہ کمرے میں کوئی نہیں تھا ۔ ان پر نظر پڑتے ہی انہوں نے کہا:

"خدا کا شکر ہے انسپکٹر صاحب آپ آگئے ؛ ورنہ میں تو شاید خوف سے ہی مر جاتا۔"

"بات کیا ہے پروفیسر صاحب" انسپکٹر جمشید نے پریشان ہو کر کہا ۔

"مجھے ایک دھمکی آمیز فون موصول ہوا ہے کہ اب سے ایک گھنٹے کے اندر تمہیں ہلاک کر دیا جائے گا، خواہ تم کچھ بھی کر لو ۔ کسی کو بھی مدد کے لیے بلا لو ۔ فون سنتے ہی میں نے آئی جی صاحب کو فون کیا ۔ انہوں نے بتایا کہ وہ آپ کو بھیج رہے ہیں ۔ مجھے آپ کا نام سن کر اطمینان ہوا اور اب بھی سکون محسوس کر رہا ہوں۔"

"ہوں، گھر میں اور کون کون ہیں؟"

"میرے بیوی بچے ہیں ۔ ایک ملازم ہے اور بس۔"

"ٹھیک ہے ۔ انہیں بھی اس کمرے میں بلا لیں، کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیں ۔ میں اور میرے بچے باہر ٹھہر کر آپ کی حفاظت کریں گے۔" انہوں نے کہا ۔

"لیکن اس طرح تو آپ کو بہت تکلیف ہوگی۔"

"تکلیف کیسی ! اگر ہم آپ کی جان بچا سکے تو یہ تو عین راحت ہوگی ۔ جلدی کریں، ایسا نہ ہو وقت گزر جائے۔" انہوں نے کہا ۔ اور پروفیسر نامی نے فوراً ان کی ہدایت پر عمل کر ڈالا ۔ دروازہ بند ہونے کے بعد انہوں نے محمود، فاروق اور فرزانہ سے کہا:

"اب تم تمام دروازے اور کھڑکیاں بند کرا دو ۔ میں چھت کا جائزہ لے آتا ہوں۔"

"لیکن ابا جان، ہمارے واپس آنے تک آپ یہیں ٹھہر جائیں ۔ تو کیا یہ بہتر نہیں ہوگا۔" فرزانہ بولی ۔

"ہاں واقعی، پہلے دروازے اور کھڑکیاں بند ہو جانی چاہییں" انہوں نے کہا اور تینوں تیز تیز قدم اٹھاتے چلے گئے ۔

"خدا جانے یہ ہو کیا رہا ہے ۔ ہم کس چکر میں پھنس گئے ہیں ۔ وہ ڈاکٹر جہاں زیب کا بچہ کہاں غائب ہو گیا ۔ ملازم حارث کس طرح ہلاک ہو گیا ۔ اب پروفیسر نامی صاحب کو کون ہلاک کرنا چاہتا ہے۔" فاروق بڑبڑایا ۔

لگا۔ محمود اور فرزانہ نے اس کی بڑبڑاہٹ پر کوئی دھیان نہ دیا۔ جلدی جلدی دروازے اور کھڑکیاں بند کرنے لگے۔ ان کے واپس پہنچنے پر انسپکٹر جمشید نے چھت کا جائزہ لیا، اس طرف سے کسی کے آنے کا امکان نہیں تھا پھر بھی انھوں نے زینے کا دروازہ بند کر دیا اور نیچے اتر آئے۔

"ابا جان، ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہم کسی چکر میں پھنس گئے ہیں۔"

"چکر لمبا ہو یا چھوٹا، ہمیں اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ یہ تو ہمارا روز کا کام ہے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"آخر پروفیسر شامی صاحب سے کسی کو کیا دشمنی ہو سکتی ہے۔"

"خطرہ ٹلنے کے بعد پروفیسر صاحب سے معلوم کریں گے۔ اس وقت تو ان کی حفاظت کا مسئلہ ہے۔"

"لیکن ابا جان، یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ گھر کے ملازم کے روپ میں ہم نے قاتل کو ان کے ساتھ کمرے میں بند کر دیا ہو۔" فرزانہ کو شاید اچانک خیال آیا۔

"اس قدر جلد وہ ملازم کا روپ کیسے دھار سکتا ہے اور اس کی جگہ لے سکتا ہے اور پھر کیا پروفیسر صاحب اپنے ملازم کو نہیں پہچانتے ہوں گے۔" انسپکٹر جمشید نے نفی میں سر ہلایا، تاہم احتیاط کے طور پر انھوں نے بلند آواز میں کہا:

"پروفیسر صاحب، کیا آپ کو اپنے ملازم پر بھروسا ہے؟"

"جی ہاں، یہ ہمارا بہت پرانا ملازم ہے۔" اندر سے کہا گیا۔

"ذرا دیکھ لیں، کہیں مجرم نے آپ کے ملازم کا روپ دھار کر اس کی جگہ تو نہیں لے لی۔"

"اوہ، میں ابھی دیکھتا ہوں۔" اندر سے آواز آئی۔ چند سیکنڈ بعد پروفیسر شامی نے کہا:

"میرے ملازم کے روپ میں مجرم ہرگز نہیں ہے۔ میں نے اطمینان کر لیا ہے۔"

"چلیے شکر ہے۔ باقی ہم دیکھ لیں گے۔"

ایک ایک منٹ کر کے ایک گھنٹا پورا ہو گیا، لیکن کچھ بھی نہ ہوا۔ کوئی بھی حملہ کرنے نہ آیا اور پھر ایک گھنٹے سے بھی پندرہ منٹ زائد ہو گئے۔ آخر انسپکٹر جمشید بولے:

"پروفیسر صاحب، مقررہ وقت سے پندرہ منٹ زائد ہو چکے ہیں۔ اب آپ کا کیا خیال ہے؟"

"میرا خیال ہے، کسی نے مجھ سے مذاق کیا تھا۔" انھوں نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

"خود ہمارا بھی یہی خیال ہے۔" وہ مسکرائے۔

"مجھے بہت افسوس ہے، آپ کا قیمتی وقت ضائع ہوا، لیکن اب آپ کھانا کھا کر ہی جائیں۔"

"جی نہیں، افسوس ہے، ہم کھانا نہیں کھا سکیں گے۔ آج گھر میں کھانا کھانا ہمارے لیے بہت ضروری ہے۔" انسپکٹر جمشید نے بیگم کا خیال

کرتے ہوئے کہا:

"خیر، ہم آپ کے بہت بہت شکر گزار ہیں۔"

"کوئی بات نہیں جناب، اگر آپ اب بھی خطرہ محسوس کر رہے ہیں تو دو سادہ لباس والے مقرر کر دیے جائیں۔"

"نہیں، میرا خیال ہے۔ اس کی ضرورت نہیں۔ یہ ضرور کسی کا مذاق تھا۔"

اور وہ وہاں سے رخصت ہوئے۔

"بات کچھ پتے نہیں پڑی۔" محمود بڑبڑایا۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی ہمارا ایک گھنٹہ ضائع کرنا چاہتا تھا۔" انسپکٹر جمشید نے کہا۔

"لیکن کیوں؟"

"خدا جانے کیوں، ابھی تک ہمیں اس کیس میں کوئی سراغ نہیں ملا۔ اوہ ہاں، ہم نے اب تک پوسٹ مارٹم کی رپورٹ نہیں پوچھی۔"

گھر پہنچتے ہی محمود، فاروق اور فرزانہ تو کھانے کی میز پر جم گئے لیکن انسپکٹر جمشید ہسپتال کو فون کرنے لگے۔

"کیا ابھی کوئی کسر رہ گئی ہے؟" بیگم جمشید نے تلملا کر کہا۔

"ہاں، تھوڑی سی کسر رہ گئی ہے۔ ابھی پوری ہو جائے گی۔ فکر نہ کرو۔"

اسی وقت دوسری طرف سے ریسیور اٹھایا گیا۔ انسپکٹر جمشید نے

اپنا نام بتانے کے بعد کہا:

"میں عدنان عارف کی پوسٹ مارٹم کی رپورٹ جاننا چاہتا ہوں۔"

"جی بہتر۔ تحریری رپورٹ تھوڑی دیر تک آپ کو مل جائے گی، فی الحال زبانی سن لیجیے۔" اس کے بعد انہیں رپورٹ سنائی جانے لگی۔ ان کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔ جو کچھ وہ سن رہے تھے، انتہائی حیرت انگیز تھا۔ اور انہیں اپنے کانوں پر اعتبار نہیں آ رہا تھا۔ ان الفاظ میں اور ڈاکٹر جہاں زیب کے الفاظ میں کوئی فرق نہیں تھا۔ رپورٹ سنانے والا ڈاکٹر کہہ رہا تھا:

"عدنان عارف کی موت بے شمار شہد کی مکھیوں کے کاٹنے سے ہوئی ہے، شہد کی مکھیوں کے ڈنک اور زہر چہرے اور ہاتھوں پر پائے گئے ہیں۔"

"آپ کا کیا نام ہے جناب؟" انسپکٹر جمشید نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔

"مجھے ڈاکٹر جہاں زیب کہتے ہیں۔"

"کیا کہا؟" انسپکٹر جمشید چونکے۔

"جی ہاں، یہی میرا نام ہے۔"

"آپ ہسپتال میں ہی ٹھہریے، مجھے آپ سے ایک ضروری کام ہے۔ میں ابھی آ رہا ہوں۔"

***

ان کے الفاظ سُن کر بیگم جمشید نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیا۔ انسپکٹر جمشید نے ریسیور رکھتے ہوئے بے چارگی کے عالم میں ان کی طرف دیکھا اور بولے:

"لیکن بیگم، اس میں میرا کیا قصور ؟"

"میں نے کب کہا ہے کہ آپ کا قصور ہے۔" انہوں نے کہا۔

"ابا جان، بات کیا ہے ؟ آپ ہسپتال کیوں جانا چاہتے ہیں؟"

"اس لیے کہ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ بالکل وہی ہے جو عدنان عارف کی کوٹھی میں آنے والے جہاں زیب نے بتائی تھی اور جس کا بعد میں محمود نے پروفیسر داؤد کی کوٹھی تک تعاقب کیا تھا اور پھر اسے رسیوں سے باندھنا پڑا تھا۔"

"اگر یہ بات ہے، تب بھی ہسپتال جا کر آپ کیا کریں گے۔ اس سے تو یہی بہتر ہے کہ پہلے ہم کھانا کھالیں۔ تاکہ صبح تک کے لیے امی جان کی ناراضی سے تو بچ جائیں۔" فرزانہ نے کہا۔

"بات تمہاری بھی معقول ہے، لیکن میں اس کا کیا کروں کہ جس ڈاکٹر نے مجھے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ پڑھ کر سنائی ہے، اس نے اپنا نام جہاں زیب بتایا ہے۔"

"کیا ؟" تینوں ایک ساتھ اچھلے۔ پھر محمود نے سنبھل کر کہا۔

"لیکن اس سے پہلے تو ہسپتال کے انچارج ڈاکٹر فاروقی تھے اور وہی ہمیں پوسٹ مارٹم کی رپورٹ بھجواتے رہے ہیں۔"

"ہو سکتا ہے، ان کی تبدیلی ہو گئی ہو۔ یا وہ چھٹی پر ہوں، لیکن ہمیں ڈاکٹر جہاں زیب کو ہر حال میں گرفتار کرنا ہوگا۔"

"ٹھیک ہے۔ واقعی ضروری ہے۔"

"خیر، ایسا کرتے ہیں کہ تم تینوں کھانا کھاؤ۔ میں ہسپتال جا کر اس سے مل آتا ہوں۔ تمہاری امی کا غصہ کسی قدر کم کرنے کا بس یہی ایک طریقہ ہے۔"

"اچھی بات ہے۔" تینوں نے ایک ساتھ کہا۔

"لیکن میرے لیے بہتر یہی ہے کہ آپ چاروں ہی ہسپتال ہو آئیں۔ تاکہ ایک ساتھ ہی کھانا کھایا جائے۔" بیگم جمشید نے برا سا منہ بنایا۔

"جیسے آپ کی مرضی۔" فاروق نے بے چارگی کے عالم میں کہا۔

"ہاں، ایک بات تو پوچھنا ہم بھول ہی گئے۔ ابھی جب ہم پروفیسر داؤد کے گھر گئے ہوئے تھے، تو کیا ہماری عدم موجودگی میں کوئی یہاں آیا تھا؟"

"جی نہیں، کوئی نہیں آیا تھا۔"

"اچھا تو ہم ابھی آدھ گھنٹے تک واپس آ جائیں گے۔ دروازہ بند رکھنا۔"

وہ ہسپتال پہنچے۔ ڈاکٹر جہاں زیب ان کا انتظار کر رہا تھا، لیکن اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی ان کی مایوسی کی کوئی حد نہ رہی کیونکہ

اس شخص کے نقوش اس سے بالکل مختلف تھے جو عدنان عارف کی کوٹھی میں آیا تھا۔

بے وزن بات

دوسرے دن کے اخبارات نے عدنان عارف کی پُراسرار موت کی خبر پہلے صفحوں پر بڑی بڑی سرخیوں سے شائع کی۔ یہ بھی ذکر تھا کہ مرحوم نے اپنی زندگی کس قدر ایمانداری سے گزاری۔ سب سے زیادہ زور پوسٹ مارٹم کی رپورٹ پر دیا گیا تھا۔ پولیس کی کئی پارٹیوں نے عدنان عارف کی کوٹھی کے اردگرد کا علاقہ کھنگال مارا تھا، لیکن کہیں کوئی شہد کی مکھیوں کا چھتہ نظر نہیں آیا تھا۔ پولیس کا پورا محکمہ حیران تھا، ان کا خیال تھا کہ اس سے زیادہ عجیب و غریب کیس سے اس سے پہلے ان کا کبھی واسطہ نہیں پڑا۔ ابھی تک کوئی یہ تک تو جان نہیں سکا تھا کہ عدنان عارف کی موت کس طرح واقع ہوئی ہے۔ سوال یہ تھا کہ اگر عدنان عارف شہد کی مکھیوں کے زہر کے ذریعے ہلاک ہوئے ہیں تو ان کے چہرے اور ہاتھوں پر اتنے بے شمار ڈنک لگنے کے نشانات کیسے بن گئے، جب کہ شہد کی مکھیوں کا وہاں نام و نشان تک نہیں تھا اور اگر ان کی موت میں کسی انسانی ہاتھ کا دخل ہو تو بھی اتنے ڈنک کس طرح لگ گئے۔ دوسری طرف کوٹھی کے بارے میں تبدیل ہونے والا معاملہ بھی عجیب و غریب تھا۔ ڈاکٹر جہاں زیب کی پُراسرار شخصیت کا ذکر بھی آیا تھا اور اس کے ساتھ پروفیسر

ڈی ٹی راؤ کا بھی کہ جہاں زیب ان کے مسافر خانے میں ٹھہرا ہوا تھا۔ محمود اور فاروق کا بھی ذکر تھا ۔ یہ بھی کہ کس طرح محمود جہاں زیب کے ہتھے چڑھ گیا تھا ۔ غرض ابھی تک معاملہ جوں کا توں تھا ۔ اور کسی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تھا ۔

ادھر عدنان عارف کی جگہ پر ان کے نائب فرحان لودھی کو متعین کر دیا گیا تھا ۔ اس کے بارے میں بھی یہ اطلاعات تھیں کہ بہت ایمان دار آدمی ہے اور اپنے افسر کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اس نے بھی کبھی رشوت نہیں لی ۔

یہ دوسری شام کا ذکر ہے ۔ انسپکٹر جمشید، محمود، فاروق، فرزانہ اور بیگم جمشید شام کی چائے پی رہے تھے اور اس کیس پر ان کی باتیں بھی جاری تھیں رات جب وہ گھر لوٹے تھے تو کھانا انہیں گرم ملا تھا اور بیگم جمشید نے بتایا تھا کہ ابھی ابھی انہوں نے اس خیال سے کھانا گرم کیا تھا کہ یہ آخری بار گرم کر رہی ہوں ۔ انہوں نے خدا کا شکر ادا کیا تھا کہ کھانا گرم مل گیا تھا ۔

" جہاں تک میرا خیال ہے ، عدنان عارف کو سوچے سمجھے منصوبے کے تحت قتل کیا گیا ہے ۔" محمود کہہ رہا تھا ۔

" تمہارے اس خیال کی وجہ ؟" فرزانہ بولی ۔

" عدنان عارف کے وہ آخری الفاظ جو انہوں نے اپنی بیٹی سے کہے : بیٹی مجھے بچاؤ ۔ لیکن نہیں تم اندر نہ آنا ، ورنہ یہ مکھیاں بھی ..... آخر کمرے میں کوئی موجود تھا ، اسی لیے انہوں نے اپنی بیٹی کو اندر آنے سے منع کیا

تھا ۔" محمود نے جواب میں کہا ۔

" تو ہم کب کہتے ہیں کہ اندر کوئی موجود نہیں تھا ، میں کہتی ہوں اندر مکھیاں موجود تھیں ۔"

" لیکن کمرے میں ایک بھی مکھی مری ہوئی نہیں پائی گئی ۔ جب کہ یہ ناممکن ہے ۔ اتنی بہت سی مکھیوں پر ایک مرتا ہوا آدمی ہاتھ بھی مار دے تو بے شمار مکھیاں ڈھیر ہو جائیں ، لیکن وہاں تو کسی مکھی کا ایک پر بھی نہیں ملا ۔" فرزانہ نے کہا ۔

" واقعی ، یہ بہت وزنی دلیل ہے ۔ چند مکھیاں تو مری ہوئی ملنی چاہییں تھیں ۔" انسپکٹر جمشید نے فرزانہ کی تائید کی ۔

" چلیے مان لیا ، اب اگر کمرے میں مکھیاں نہیں تھیں تو عدنان عارف کس طرح ہلاک ہو گئے ؟" محمود بولا ۔" جب کہ خود آپ کا بیان یہ ہے کہ کھڑکی کے ذریعے کوئی شخص اندر داخل نہیں ہوا ۔ آپ چھت کا بھی جائزہ لے چکے ہیں ، نیچے کا دروازہ بھی اندر سے بند تھا ، تب پھر وہ کون تھا جس نے عدنان عارف کو ہلاک کیا ۔ سیکڑوں مکھیوں کے بغیر سیکڑوں جگہ مکھیوں کے ڈنک کس طرح لگ گئے ؟" محمود کہتا چلا گیا ۔

" تمہاری باتوں میں بھی بہت وزن ہے ۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے ۔

" ابا جان ، اگر اجازت ہو تو میں ایک بے وزن بات کہہ دوں ۔"

فاروق نے سنجیدہ لہجے میں کہا ۔

" تم سے اور امید کی بھی کیا کی جا سکتی ہے ۔" فرزانہ نے برا سا منہ بنایا ۔

"اب ان حالات میں میں اور کر بھی کیا سکتا ہوں۔ دیکھو نا، تمہاری باتیں بھی بہت باوزن ہیں اور محمود کی بھی — جب کہ تمہاری باوزن باتوں کے باوجود ہم کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پا رہے — ہو سکتا ہے میری بے وزن بات ہمیں کسی نتیجے پر پہنچا دے۔" فاروق نے حد درجے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"لو اور سنو! اب ہم بے وزن باتوں سے کسی نتیجے پر پہنچا کریں گے۔"

"بھئی سن لینے میں کیا حرج ہے۔" بیگم جمشید بولیں۔

"آپ کہتے ہیں تو سن لیتے ہیں، ورنہ اس کی بے وزن بات ہمیں ڈانواں ڈول ہی کر سکتی ہے۔"

"چلو تھوڑی دیر کے لیے ہو لینا ڈانواں ڈول۔" انسپکٹر جمشید نے مسکرا کر کہا — پھر فاروق سے بولے:

"ہاں بھئی فاروق، کیا کہنا چاہتے ہو۔"

"صرف یہ کہ جس وقت ہم اظہار آباد سے گزر رہے تھے، اس وقت میں نے اور محمود نے مکھیوں کا ایک لشکر اپنے سروں کے اوپر سے بھیں کرکے گزرتے دیکھا تھا۔"

"تمہارا مطلب ہے شہد کی مکھیوں کا۔" انسپکٹر جمشید نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔

"جی نہیں ابا جان، وہ شہد کی مکھیاں نہیں تھیں — اگر شہد کی ہوتیں تو میں یہ بات بہت پہلے آپ کو بتا چکا ہوتا۔" محمود نے برا سا منہ

بنا کر کہا۔

"مکھیوں کے لشکر سے تمہاری کیا مراد ہے؟" انسپکٹر جمشید نے کہا۔

"بے شمار مکھیاں پرندوں کی کسی ڈار کی صورت میں اڑتی ہوئی گزری تھیں۔" فاروق نے کہا۔

"جب کہ مکھیوں کی یہ عادت نہیں۔" انسپکٹر جمشید بڑبڑائے۔

"جی ہاں، یہی تو میں بھی کہتا ہوں۔"

"ٹھہرو، میں پروفیسر صاحب سے بات کرتا ہوں۔" انہوں نے بے قراری کے عالم میں کہا اور پروفیسر داؤد کے نمبر گھمائے۔

"ہیلو پروفیسر صاحب، میں جمشید بول رہا ہوں۔"

"حد ہو گئی، ابھی تک تم فون پر ہی باتیں کر رہے ہو — تمہارا تو یہاں آنے کا وعدہ تھا۔"

"اوہ، جی ہاں — مجھے یاد ہے، لیکن ایک چکر چل گیا — آپ نے اخبار میں پڑھ ہی لیا ہوگا — یعنی عدنان عارف والا کیس — اس کیس میں محمود اور فاروق بھی الجھ گئے تھے۔ میں اس سلسلے میں کافی پریشان ہوں، کیونکہ ابھی تک معاملہ پلے نہیں پڑا — ویسے آپ پسند کریں تو ہم ابھی اسی وقت آنے کے لیے تیار ہیں۔"

"خیر، پہلے اس کیس سے نبٹ لو، پھر میں تم سے سمجھوں گا۔"

"اس وقت میں نے ایک بات معلوم کرنے کے لیے فون کیا ہے۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کیا مکھیاں پرندوں کی ڈار کی صورت میں

اڑتی ہیں۔"

"نہیں، ان میں اس قسم کی کوئی تنظیم یا عادت نہیں ہوتی، پھر بھی میں پورے یقین سے یہ بات نہیں کہہ سکتا۔ تم یوں کرو کہ میرے دوست پروفیسر جیلانی سے معلوم کرلو۔ ان کا نمبر نوٹ کرلو۔۔۔ وہ حشرات الارض کے ماہر ہیں۔" انہوں نے کہا اور پھر نمبر نوٹ کرادیے۔

"بہت بہت شکریہ پروفیسر صاحب، میں ابھی انہیں فون کرتا ہوں۔" انہوں نے کہا اور پھر پروفیسر کے نمبر ڈائل کیے۔ دوسری طرف سے فوراً ہی جواب ملا:

"ہیلو، کون صاحب؟"

"پروفیسر جیلانی پلیز۔ آپ کو کس سے بات کرنی ہے؟"

"آپ ہی سے جناب، میرا نام انسپکٹر جمشید ہے اور میں پروفیسر داؤد کا دوست ہوں۔ انہوں نے ہی آپ کے نمبر دیے تھے۔ آپ سے ایک سوال پوچھنا ہے۔"

"فرمائیے، مجھے جواب معلوم ہوا تو ضرور بتادوں گا۔" دوسری طرف سے سنجیدہ آواز میں کہا گیا۔

"عام مکھیاں پرندوں کی ڈار کی صورت میں پرواز کرتی ہیں یا نہیں؟ کیا کسی بھی صورت میں یہ ممکن ہے؟"

"جی نہیں، عام مکھیاں اس طرح پرواز نہیں کرتیں! البتہ شہد کی مکھیاں ڈار کی صورت میں پرواز کرتی ہیں۔"

"بہت بہت شکریہ۔ مجھے بس یہی معلوم کرنا تھا۔" انہوں نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

"محمود، فاروق تم دونوں کو دھوکا تو نہیں ہوا تھا۔ کہیں وہ مکھیوں کی بجائے کچھ اور تو نہیں تھیں۔"

"جی نہیں، وہ مکھیاں ہی تھیں۔ انہیں اس طرح اڑتے دیکھ کر ہمیں بھی بہت حیرت ہوئی تھی۔" محمود بولا۔

"پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ پروفیسر داؤد اور پروفیسر جیلانی کا کہنا یہ ہے کہ عام مکھیاں ڈار کی صورت میں سفر نہیں کرتیں۔ پھر وہ مکھیاں ڈار کی صورت میں سفر کیوں کررہی تھیں۔" انسپکٹر جمشید پریشان ہو کر بولے۔

"فاروق کی بے وزن بات نے تو اور بھی الجھن میں مبتلا کردیا ہے۔" محمود نے جھلا کر کہا۔

"لیکن اس میں میرا کیا قصور۔ میں نے تو ایک بہت پتے کی بات...... یاد کرائی ہے۔ آخر وہ مکھیاں عدنان عارف کے گھر کی طرف سے کیوں آرہی تھیں۔ کیا وہ عدنان عارف کو ہلاک کرکے آرہی تھیں۔"

"وہ شہد کی مکھیاں نہیں تھیں۔" محمود نے جھلا کر کہا: "اور عدنان عارف کی موت شہد کی مکھیوں کے زہر سے ہوئی ہے۔"

"لیکن آس پاس شہد کی مکھیوں کا کوئی نشان نہیں ملا۔" فاروق

نے بھی جھنجلا کر کہا:

"ایسا معلوم ہوتا ہے، یہ کیس ہمیں جھلاہٹ کے دوروں میں مبتلا کر دے گا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"آپ ہی بتائیں، آخر یہ سب کیا ہے؟"

"سنو، میں نے کچھ اندازہ لگایا ہے، لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ اندازہ درست ہی ہو۔ ڈاکٹر جہاں زیب کے نام سے ایک شخص کا عدنان عارف کی موت کے بعد ان کی کوٹھی میں آنا اور ڈائنامیٹ رکھ کر چلے جانا یہ ظاہر کرتا ہے کہ عدنان عارف کی موت میں انسانی ہاتھ کو دخل ہے۔ ورنہ جہاں زیب کی کوٹھی بم سے اڑانے کی کیا ضرورت تھی۔ محمود ان کی باتیں سن چکا ہے۔ نقلی ڈاکٹر جہاں زیب کرنا کچھ اور چاہتا تھا جسے اس نے کام نمبر ایک کہا تھا۔ لیکن شاید وہ ہماری وجہ سے وہ کام نہ کر سکا اور مجبوری کے عالم میں ڈائنامیٹ وہاں رکھ کر چلا گیا۔ اس سے میں یہ بھی سمجھا ہوں کہ وہ وہاں سے کوئی چیز اڑا لے جانا چاہتا تھا۔ اب یہ سوچنا ہمارا کام ہے کہ وہ کیا چیز تھی جسے اس نے ڈائنامیٹ کے ذریعے ختم کر دیا۔" یہاں تک کہہ کر انسپکٹر جمشید خاموش ہو گئے۔

"کمال ہے ابا جان، آپ نے تو اس مسئلے کو بالکل واضح کر دیا۔" فرزانہ خوش ہو کر بولی۔

"لیکن میں ابھی تک یہ واضح نہیں کر سکا کہ عدنان عارف کو کس

طرح ہلاک کیا گیا۔ یہ ضرور یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ انہیں منصوبہ بنا کر ہلاک کیا گیا ہے۔"

عین اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ انسپکٹر جمشید نے فوراً ریسیور اٹھایا اور بولے:

"انسپکٹر جمشید پلیز۔"

"ہیلو جمشید، فوراً پروفیسر داؤد کے گھر پہنچو۔ ان کا ابھی ایک عجیب فون موصول ہوا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ مکھیوں کی ایک فوج ان پر حملہ کرنے کے لیے ان کی کھڑکیوں پر زور آزمائی کر رہی ہے۔ میں بھی وہیں پہنچ رہا ہوں۔"

"جی۔" انسپکٹر جمشید حیرت زدہ لہجے میں بولے، لیکن دوسری طرف سے سلسلہ بند کیا جا چکا تھا۔

"محمود، فاروق آؤ۔" ریسیور رکھتے ہی وہ بولے اور اٹھ کر دروازے کی طرف دوڑے۔ بیگم جمشید ارے ارے ہی کرتی رہ گئیں۔ ان تینوں نے بھی ان کے پیچھے دوڑ لگا دی۔

"لو، آج پھر گرم کرو چائے بار بار۔" بیگم جمشید نے بُرا سا منہ بنایا اور دروازہ بند کرنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

***

پروفیسر نامی کی کوٹھی کے سامنے پولیس اور بہت سے دوسرے لوگ موجود تھے۔ کوٹھی کے تمام دروازے اور کھڑکیاں بند تھیں اور اندر سے پروفیسر نامی بدستور چلا رہے تھے۔

"مجھے بچاؤ، ان خونی مکھیوں سے بچاؤ۔ یہ مجھے ہلاک کر دیں گی، علامہ عارف کی طرح یہ مجھے ہلاک کر دیں گی۔"

نیچے کھڑے لوگ حیران تھے۔ اوپر والی منزل کی کھڑکیوں کے شیشوں سے سیکڑوں مکھیاں بار بار ٹکرا رہی تھیں۔ ان کے ٹکرانے سے ٹن ٹن ٹکاٹک کی باریک آوازیں ابھر رہی تھیں۔

انسپکٹر جمشید نے اپنی جیپ بھیڑ سے کچھ فاصلے پر ہی روک لی، وہ اترے ہی تھے کہ آئی جی صاحب ان کی طرف لپکے۔

"جمشید تم دیکھ رہے ہو۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔"

"مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا۔" وہ بولے۔

"اب تم ہی بتاؤ، ہم پروفیسر نامی کو کس طرح بچائیں؟"

"اب تک کیا کیا گیا ہے؟" انسپکٹر جمشید بولے۔

"فائر بریگیڈ والوں کو فون کر دیا ہے۔ پولیس والے دھوئیں کے بم لے کر روانہ ہو چکے ہیں، امید ہے کہ دھوئیں کے بم سے یہ مکھیاں بھاگ جائیں گی۔" انھوں نے کہا۔

"جب کہ میرا خیال ہے ایسا نہیں ہوگا۔" انسپکٹر جمشید نے مکھیوں کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ ان کے شیشوں سے ٹکرانے کی آواز نہیں سن رہے۔ یہ اصل مکھیاں نہیں ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"میرا مطلب ہے۔ یہ خدا کی پیدا کردہ مکھیاں نہیں ہیں۔"

"تو پھر؟" آئی جی صاحب کے لہجے میں حیرت تھی۔ اسی وقت ڈی آئی جی صاحب بھی آتے نظر آئے۔

"میرے خدا، یہ کیا ہو رہا ہے؟"

"اچھا ہوا آپ بھی آ گئے۔ جمشید کا خیال ہے کہ یہ مصنوعی مکھیاں ہیں، یعنی مشینی مکھیاں۔ لہذا دھوئیں کا بم بھی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔"

"اوہ!" ان کے منہ سے نکلا۔

"یہ اندازہ تو میں نے ان کے بار بار شیشوں سے ٹکرانے کے بعد ہی لگایا تھا۔

سوال یہ ہے کہ پروفیسر نامی اپنے کمرے سے نکل کر کسی دوسرے کمرے میں کیوں بند نہیں ہو جاتے، یا وہ نیچے کیوں نہیں اتر آتے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ٹھہرو، میں ان سے پوچھتا ہوں۔" یہ کہہ کر آئی جی صاحب پولیس کی گاڑی میں لگے لاؤڈ اسپیکر کے پاس گئے اور بلند آواز میں بولے،

"ہیلو نامی صاحب، آخر آپ نیچے کیوں نہیں آ جاتے۔"

"میرے نیچے آتے ہی یہ مکھیاں میری طرف رُخ کر لیں گی۔ اور اس وقت دنیا کی کوئی طاقت مجھے ان سے نہیں بچا سکے گی۔"

"تو پھر آپ اپنے کمرے سے نکل کر کسی اور کمرے میں گھس جائیں، جس میں شیشے نہ ہوں۔" آئی جی صاحب بولے۔

"میں اپنے کمرے سے نہیں نکل سکتا، یہ میرے کمرے کے باہر برآمدے میں بھی موجود ہیں۔"

"آپ کے بیوی بچے اور ملازم کہاں ہیں؟" انہوں نے پوچھا۔

"وہ دوسرے کمرے میں ہیں، لیکن آپ ان کی طرف سے بے فکر رہیں — یہ مکھیاں انہیں کچھ نہیں کہیں گی۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" آئی جی صاحب کے لہجے میں حیرت تھی۔

"آپ ان مکھیوں کو نہیں جانتے جناب — ارے وہ شیشہ ٹوٹا — ہم، میں گیا، آئی جی صاحب — میں گیا — اب آپ مجھے نہیں بچا سکیں گے — میرے بچو، خدا حافظ — بیگم خدا حافظ — خدا۔"

اس کے بعد پروفیسر طاہی کی کوئی آواز نہ سنی گئی۔

"اب جب کہ ان کے خیال میں ہم انہیں نہیں بچا سکتے تو کیوں نہ دروازے توڑ دیے جائیں اور اندر داخل ہو کر انہیں بچانے کی کوشش کی جائے۔" انسپکٹر جمشید نے چلا کر کہا۔

"بالکل ٹھیک، دروازہ توڑ دیا جائے اور پروفیسر طاہی کے کمرے میں پہنچ کر انہیں بچانے کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔" آئی جی صاحب

نے وہاں موجود پولیس کے جوانوں کو حکم دیا اور وہ دروازے پر پل پڑے۔ جوں ہی دروازہ ٹوٹا — وہ بے تحاشا اندر گھس گئے اور اوپر چڑھتے چلے گئے — اوپر پہنچ کر انہیں ایک اور دروازہ توڑنا پڑا۔

اور پھر وہ سب دھک سے رہ گئے — ادھر انسپکٹر جمشید نے اوپر آنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ انہوں نے محمود، فاروق اور فرزانہ کو بھی روک لیا تھا —

"کیوں ابا جان! کیا آپ کے خیال میں ہم اوپر کچھ نہیں کر سکیں گے؟" فرزانہ نے بے چین ہو کر کہا۔

"یہ بات نہیں، اوپر جانے کا اب کوئی فائدہ نہیں — وہ دیکھو، مکھیاں واپس نکل رہی ہیں — آؤ ہم ان کا تعاقب کریں۔"

"مکھیوں کا تعاقب۔" فاروق کے منہ سے حیرت زدہ انداز میں نکلا —

"ہاں، مکھیوں کا تعاقب، اگر ہمیں یہ معلوم ہو گیا کہ یہ کہاں سے آتی ہیں تو گویا ہم نے میدان مار لیا۔"

"بہت خوب، تو پھر چلیے۔"

وہ جلدی جلدی جیپ میں بیٹھے اور مکھیوں کے پیچھے چل پڑے — مکھیاں ایک ڈار کی صورت میں اڑی جا رہی تھیں — بے شمار دوسرے لوگوں نے بھی یہ حیرت ناک منظر دیکھا۔

"ہم سے ایک بھول ہو گئی ہے۔" کچھ دور ہی گئے ہوں گے کہ

انسپکٹر جمشید بول پڑے۔

"اور وہ کیا؟"

"کہیں ڈاکٹر جہاں زیب پروفیسر نامی کی کوٹھی میں بھی کام نمبر ایک یا کام نمبر دو دکھانے نہ آ جائے۔ محمود — تم نیچے اتر کر واپس چلے جاؤ اور آئی جی صاحب کو یہ بات بتا کر کسی رکشے میں بیٹھ کر ہمارے پیچھے آ جاؤ۔"

"جی بہت بہتر۔" محمود نے کہا اور انسپکٹر جمشید نے جیپ روک لی۔ محمود چھلانگ لگا کر نیچے اتر آیا۔ وہ آگے بڑھتے چلے گئے لیکن ان کی پریشانی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ کیونکہ مکھیوں کی پرواز اونچی ہی اونچی ہوتی جا رہی تھی، اس صورت میں اور تھوڑی دیر بعد وہ ان کی نظروں سے اوجھل ہو جاتیں — انہوں نے وائرلیس کے ذریعے دفتر فون کیا اور بتایا کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ فوراً ہوائی اڈے کو فون کیا گیا — وہاں سے ایک ہیلی کاپٹر اڑا، لیکن اتنی دیر میں مکھیاں ان کی نظروں سے بالکل اوجھل ہو چکی تھیں — وہ ناکام واپس لوٹے تو پتا چلا، پروفیسر نامی ختم ہو چکے تھے — ان کے چہرے اور ہاتھوں کا بالکل وہی حال تھا جو عدنان عارف کا ہوا تھا۔

پھندا

انسپکٹر جمشید سیدھے آئی جی صاحب کے پاس پہنچے، انہیں اپنی ناکامی کی خبر سنائی اور بولے:

"پروفیسر نامی کے کمرے میں پولیس والوں کے سوا کوئی اور تو اب تک داخل نہیں ہو سکا۔"

"محمود کے ذریعے تمہارا پیغام ملنے کے بعد یہ کس طرح ممکن تھا کہ میں اندر کسی اور کو داخل ہونے دیتا۔ ویسے ابھی تک کسی نے ایسی کوشش بھی نہیں کی۔"

"بہت خوب، اب ہم اس کمرے کا جائزہ لیں گے اور اس چیز کو تلاش کریں گے جس پر وہ مکھیاں آتی ہیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"کیا مطلب؟" آئی جی چونکے۔

"کوئی ایسی چیز ضرور اس شخص کے کمرے میں پہنچائی جاتی ہے، جسے مکھیوں کے ذریعے ختم کرانا ہوتا ہے۔ نقلی ڈاکٹر جہاں زیب وہی چیز عدنان عارف کے کمرے سے اڑانے آیا تھا لیکن ہماری موجودگی میں وہ ایسا نہ کر سکا۔ شاید اسی لیے کہ وہ ہمیں پہچانتا تھا لیکن وہ چاہتے ہوئے

وہ ڈائنامیٹ رکھ گیا۔ نہ جانے کس طرح ہم نہیں دیکھ سکے، بس ہماری زندگی تھی کہ فرزانہ نے بم کی موجودگی کو محسوس کر لیا۔ بالکل اسی طرح اس کمرے میں بھی ضرور کوئی چیز موجود ہے۔ ہم اسے تلاش کر کے ہی چھوڑیں گے۔ تاکہ آئندہ کی تیاری مکمل کر لیں۔ وہ ہیلی کاپٹر ہر وقت تیار رکھے جائیں۔ شہر میں ریڈیو کے ذریعے یہ اعلان کرا دیں کہ جوں ہی کسی شخص کو اپنے گھر کے شیشوں پر مکھیاں ٹکراتی نظر آئیں، وہ پولیس کو فون کر دے۔ پولیس فوراً ہیلی کاپٹروں کے ذریعے وہاں پہنچے، صرف اسی طرح مکھیوں کا تعاقب کیا جا سکتا ہے۔"

"اچھی بات ہے۔ یہ میں ابھی کرائے دیتا ہوں، لیکن سوال یہ ہے کہ یہ مکھیاں صرف کھڑکیوں کے شیشوں سے کیوں سر ٹکراتی ہیں، روشندانوں سے اندر کیوں نہیں گھس جاتیں۔"

"اس کی ضرور کوئی وجہ ہوگی۔ میں یہاں سے فارغ ہو کر پروفیسر داؤد سے ایک ملاقات کروں گا۔ ہم دیکھیں گے کہ ان مکھیوں کا کیا انتظام کیا جا سکتا ہے۔"

"بہت خوب۔" آئی جی صاحب نے اطمینان کا سانس لیا۔ اسی وقت ڈی آئی جی صاحب پروفیسر نامی کے کمرے سے نکلتے نظر آئے:

"مجھے تو کچھ نہیں ملا۔ آخر یہ مکھیاں صرف ایک ہی آدمی کو

اپنا شکار کیوں بناتی ہیں۔ گھر کے دوسرے آدمیوں کو کیوں معاف کر دیتی ہیں۔" انہوں نے نزدیک آتے ہوئے کہا۔

"شاید بہت جلد اس سوال کا جواب ہمیں مل جائے گا۔ آپ فکر نہ کریں۔" یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید، محمود، فاروق اور فرزانہ کو ساتھ لے کر کمرے میں داخل ہوئے اور بولے:

"نہایت باریک بینی سے کمرے کا جائزہ لینا ہے، وہ چیز ہماری نظروں سے پوشیدہ نہ رہ جائے۔"

"بہت بہتر ابا جان۔" انہوں نے ایک ساتھ کہا اور پھر چاروں کمرے کے ایک ایک انچ کا جائزہ لینے لگے۔ کمرے کی دیواریں، فرش، کھڑکیوں کی چوکھٹیں، شیشے، جالیاں، میز، میز کی درازیں۔ غرض کوئی چیز ایسی نہ تھی جو انہوں نے دیکھ نہ لی ہو۔ ان کی یہ تلاش پندرہ منٹ تک جاری رہی، لیکن کچھ نہ ملا۔ ان کے چہروں پر مایوسی دوڑنے لگی۔ یہ دیکھ کر انسپکٹر جمشید بولے:

"جس چیز کی ہم تلاش کر رہے ہیں، وہ اس کمرے میں ضرور موجود ہے۔ اور ہمیں اس چیز کو ہر حال میں تلاش کرنا ہے، ورنہ یہ مکھیاں وبالِ جان بن جائیں گی۔ مکھیوں کو بنانے والا جس شخص کو بھی چاہے، نہایت آسانی سے گھر بیٹھے ختم کر دے گا۔"

ان کے الفاظ نے محمود، فاروق اور فرزانہ پر جوش طاری کر دیا۔ ایک بار پھر انہوں نے باریک بینی سے تلاش شروع کر دی۔ داخل

انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ کیا چیز تلاش کر رہے ہیں۔ اگر یہ معلوم ہوتا تو پھر یہ کام ان کے لیے زیادہ مشکل ثابت نہیں ہو سکتا تھا۔ خود انسپکٹر جمشید بھی تو تلاش میں ان کا ساتھ دے رہے تھے، لیکن ابھی تک کامیابی نے ان کے قدم نہیں چومے تھے۔

"میرے خدا! آخر میں نے اسے تلاش کر ہی لیا۔" انھوں نے محمود کی حیرت زدہ آواز سنی۔ وہ تیزی سے اس کی طرف مڑے۔ انھوں نے دیکھا، محمود ٹوٹے ہوئے شیشے کے بالکل سامنے والی دیوار کو تک رہا تھا۔ لیکن دیوار پر انہیں کچھ بھی نظر نہیں آیا۔

"کیا تمہاری آنکھیں چل گئی ہیں؟" فاروق نے حیران ہو کر کہا۔

"دماغ تمہارا چل گیا ہوگا۔" فرزانہ نے جل بھن کر کہا۔

"محمود، کیا بات ہے۔ تم نے کیا چیز تلاش کی ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"وہی چیز ابا جان، جو ہم تلاش کر رہے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ میں غلطی پر نہیں ہوں۔"

"اس میں کیا شک ہے، کیونکہ اس وقت تو تم کمرے کے فرش پر ہو۔" فاروق نے کہا۔

"فاروق، یہ صرف کام کا وقت ہے۔" انسپکٹر جمشید نے اسے ڈانٹا۔

"آئی ایم سوری ابا جان۔" فاروق جلدی سے بولا۔

"لیکن ابا جان، فاروق بھی تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔ محمود دیوار پر

ایک جگہ نظریں جمائے بیٹھا ہے۔ جب کہ ہمیں دیوار پر کچھ بھی نظر نہیں آ رہا۔ کیا آپ کچھ دیکھ سکتے ہیں؟"

"نہیں، نظر تو خیر مجھے بھی کچھ نہیں آ رہا، لیکن محمود نے بھی تو بلا وجہ یہ دعویٰ نہیں کر دیا ہوگا کہ اس نے وہ چیز تلاش کر لی ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے اور پھر محمود کی طرف بڑھے۔

"ہاں بھئی، کیا چیز ہے وہ اور کہاں ہے؟" انھوں نے کہا۔

"اس دیوار پر، میری نظروں کے بالکل سامنے، میرے سر سے ذرا اوپر۔"

"لیکن مجھے تو یہاں کچھ بھی نظر نہیں آ رہا ہے۔" انسپکٹر جمشید الجھ کر بولے۔

"تب آپ میری جگہ پر آ جائیں اور یہاں سے دیوار کے اس حصے کو دیکھیں جسے میں دیکھ رہا ہوں۔" یہ کہہ کر محمود نے باقاعدہ اپنے پیروں کے نشان بنائے اور وہاں سے ہٹ گیا۔ انسپکٹر جمشید نے اس کے پیروں پر پیر رکھے، لیکن انہیں کچھ نظر نہ آیا۔

"شاید فاروق کی بات ہی درست ہے، لیکن میں یہ نہیں کہوں گا کہ کیا تمہاری آنکھیں چل گئی ہیں۔ میں یہ کہوں گا، کہیں تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا۔"

"جی نہیں ابا جان، وہ کھوٹا پیسہ نہیں ہے۔" محمود نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

"تو پھر وہ چیز مجھے نظر کیوں نہیں آتی، جو تمہیں نظر آ رہی ہے؟"

"شاید اس دفعہ ہمارا واسطہ کسی بہت زبردست سائنسدان سے پڑ گیا ہے ۔ فاروق، تم اس جگہ آ کر دیکھنا ۔"

"جب ابا جان کو دیوار پر کچھ نظر نہ آیا تو بھلا مجھے کیا نظر آئے گا ۔" فاروق نے منہ بنا کر کہا ۔

"بھئی، تم آؤ تو سہی ۔"

"آنے کو تو میں تمہارے سر پر بھی آ جاؤں گا ۔ لیکن ڈرتا ہوں کہیں پھسل نہ پڑوں ۔" یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا ۔ انسپکٹر جمشید پیچھے ہٹ گئے ۔ فاروق نے پیروں کے نشانات پر کھڑے ہوتے ہوئے کہا ۔

"بھئی، تم کچھ بھی کر لو، اس بار تمہارا تجربہ بری طرح ناکام ہو ۔ ناکام ہو ۔ ناکام ہو ۔" بالکل ایسا لگا جیسے ریکارڈ کی سوئی اٹک گئی ہو ۔

"ہائیں ہائیں، تم ریکارڈ میں تو تبدیل نہیں ہو گئے ۔" فرزانہ کے لہجے میں بلا کی حیرت تھی ۔

"نہیں، بلکہ مجھے وہ چیز نظر آ گئی ہے، جو یہ مجھے دکھانا چاہتا تھا ۔ لہٰذا اب میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ محمود کا دماغ نہیں چلا ۔"

"لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ تم دونوں کا دماغ چل گیا ہو ۔" فرزانہ نے جھلا کر کہا اور آگے بڑھی ۔ فاروق کو دھکا دیا اور خود اس جگہ پر کھڑی ہو گئی ۔ جونہی اس کی نظریں دیوار پر پڑیں وہ چونک اٹھی ۔

"ارے ۔ یہاں تو واقعی وہ چیز موجودب ہے ۔"

"یہ کیا چکر ہے بھئی ۔ مجھے وہ چیز نظر نہیں آئی ۔ وہ چیز کہیں جادو

کی تو نہیں، یا پھر یہ دیوار جادو کی تو نہیں، یا میری نظر کمزور ہو گئی ہے ۔"

"جی، اب ہم کیا کہہ سکتے ہیں ۔" محمود نے بے چارگی کے عالم میں کہا ۔

"خیر، میں سمجھ گیا ۔ ہٹو فرزانہ، اب میں بھی اس چیز کو دیکھ لوں گا ۔"

یہ کہہ کر وہ قدموں کے نشانات پر کھڑے ہو گئے اور کچھ نیچے ہو کر دیکھا، گویا انہوں نے اتنی اونچائی سے دیکھنے کی کوشش کی، جس سے ان تینوں نے دیکھا تھا ۔ ظاہر ہے کہ ان کا قد ان سے کافی لمبا تھا ۔ سیدھے کھڑے ہو کر وہ اس جگہ کو اس زاویے سے نہیں دیکھ سکتے تھے جس سے کہ وہ تینوں ۔ جوں ہی وہ جھکے، انہیں وہ چیز نظر آ گئی ۔

✻ ✻ ✻

"ارے یہ تو ایک چھلا سا ہے ۔ دیوار پر چپکا ہوا ۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ ہمیں اس جگہ کے علاوہ کسی اور جگہ سے نظر کیوں نہیں آیا ۔" یہ کہتے ہوئے ان کی نظریں چھلے پر جم گئیں ۔ یہ ایک سنہری رنگ کا چھلا تھا ۔ اس میں سے نیلگوں شعاعیں نکل رہی تھیں ۔ وہ بالکل کھڑکی کے شیشے کی سیدھ میں تھا ۔

انسپکٹر جمشید دوڑ کر باہر گئے اور شیخ صاحب اور خان صاحب کو بلا لائے ۔ ان پر جوش کی کیفیت طاری تھی ۔ انہیں دیوار پہ

چھلاوا دکھانے میں آدھا منٹ صرف ہوا۔

"لیکن جمشید، یہ آخر کیا چکر ہے؟"

"چکر اب میری سمجھ میں آنے لگا ہے جناب — جس شخص نے بھی وہ مشینی مکھیاں بنائی ہیں۔ وہ بہت خطرناک آدمی ہے۔ وہ جس آدمی کو ہلاک کرنا چاہتا ہے، وہ اس کے گھر کی کسی کھڑکی کے بالکل سامنے اس قسم کا چھلا لگا دیتا ہے۔ اس چھلے سے لہریں نکلتی ہیں — مکھیاں ان لہروں کے ذریعے کھنچی چلی آتی ہیں۔ اس طرح ان کی زد میں جو آدمی بھی آ جاتا ہے، وہ اسے ہلاک کر دیتی ہیں — یہی وجہ ہے کہ یہ گھر کے دوسرے افراد کو کچھ نہیں کہتیں۔ انہیں تو دراصل اس رنگ پر آنا ہوتا ہے۔"

"تب پھر وہ واپس کیوں چلی جاتی ہیں؟" آئی جی صاحب نے پوچھا —

"وہ شخص خود انہیں کنٹرول کرتا ہے۔ زیادہ طاقت ور لہروں کے ذریعے واپس بلا لیتا ہوگا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"حیرت انگیز — بہت حیرت انگیز — سوال یہ ہے کہ اب تم کیا کرو گے؟"

"صبح کے اخبارات میں میرا ایک بیان ہوگا — لوگوں نے اگر میری ہدایات پر عمل کیا تو ہر شخص ان مکھیوں سے بچ جائے گا، ورنہ کوئی نہ کوئی آدمی ان کا شکار ہوتا ہی رہے گا۔"

"آخر وہ شخص کیا چاہتا ہے جس نے ان مکھیوں کو ایجاد کیا ہے؟" فرزانہ بولی۔

"خدا جانے، اس کے کئی مقصد ہو سکتے ہیں، جن پر بعد میں بات ہوگی۔ فی الحال تو ہمیں بچاؤ کی تدابیر کرنی ہیں — عجیب بات ہے کہ یہ رنگ بغور دیکھنے پر بھی نظر نہیں آتا، بس ایک خاص زاویے سے نظر آ جاتا ہے۔"

"یہی تو خوبی ہے — عدنان عارف کے کمرے سے بھی شاید وہ نقلی ڈاکٹر یہی رنگ اتارنے آیا تھا — لیکن ہمارے سامنے نہ اتار سکا، اور ڈائنامیٹ رکھ کر چلا گیا۔"

"لیکن ابا جان! اسے وہ رنگ اتارنے کے لیے آنے کی کیا ضرورت تھی، یہ کون سا کسی کو نظر آتا ہے۔" فرزانہ نے اعتراض کیا —

"کسی کو نہ سہی۔ ہم جیسوں کو تو نظر آ گیا ہے نا۔" وہ مسکرائے۔

"کم از کم ایک بات ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں اور وہ یہ کہ پروفیسر ٹامی ضرور اس شخص کے بارے میں کچھ جانتے تھے جس نے مکھیاں ایجاد کی ہیں — مرنے سے پہلے ان کے الفاظ سے صاف ظاہر تھا جیسے وہ ان مکھیوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔" محمود بولا۔

"اچھی طرح تو خیر نہیں، البتہ واقف ضرور رہے ہوں گے، اگر اچھی طرح واقف ہوتے تو ان سے نہایت آسانی سے بچ سکتے تھے — ہو سکتا ہے، ان مکھیوں کا موجد پروفیسر ٹامی کا دوست ہو۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"اب تم کیا کرو گے؟"

"مکھیوں کے آئندہ حملے کا انتظار، کیونکہ اس مرتبہ ہم ان کا تعاقب کرنے کے لیے پوری طرح تیار ہوں گے۔" انھوں نے کہا۔

"لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس بار مکھیاں رات کو حملہ کریں، ظاہر ہے، تمھاری احتیاطی تدابیر اور مکھیوں کے تعاقب کا خیال اسے بھی معلوم ہو جائے گا۔"

"پروا نہیں۔" انھوں نے شانے اچکائے۔

"اچھا تو پھر ہم یہ سب کچھ تم پر چھوڑتے ہیں، جو تمھارے جی میں آئے، وہ کرو۔" آئی جی صاحب نے گویا بات ختم کرتے ہوئے کہا، پھر وہ دونوں وہاں سے رخصت ہو گئے اور انھوں نے پروفیسر داؤد کے گھر کا رخ کیا۔ روانہ ہونے سے پہلے وہ اس چھلے کو اتارنا نہیں بھولے تھے۔ اسے اتارنے کے لیے انھوں نے محمود کا چاقو استعمال کیا۔ چھلا کسی سٹکر کی طرح چپکا ہوا تھا۔ یہ کاغذ کی طرح پتلا تھا۔

محمود نے پروفیسر داؤد کے دروازے کی گھنٹی بجائی تو شائستہ دوڑی آئی۔ اس کے پیچھے پروفیسر بھی خوش خوش چلے آ رہے تھے۔

"پیارا ہو تو وعدے کے پکے انسان۔" انھوں نے بچوں کی طرح چہک کر کہا۔

"لیکن پروفیسر صاحب، اس وقت میں مکھیوں پر بات کرنے آیا ہوں۔"

"یہ تم نے مجھے مکھیوں کا سپیشلسٹ کس طرح سمجھ لیا؟" وہ مسکرائے۔

"معاملہ بہت پیچیدہ ہے۔ اس وقت تک دو آدمیوں کو مکھیوں کا شکار بنایا جا چکا ہے۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اب مکھیاں کس پر حملہ کریں، لہٰذا میں اس مسئلے پر آپ سے بات کرنے آیا ہوں۔"

"بہت تیز ہے کی۔" پروفیسر صاحب مسکرا کر بولے، پھر کہنے لگے:

"واقعی، اس وقت ضرورت بھی اس کی ہے۔ آؤ، میرے کمرے میں ہی آ جاؤ۔ وہاں ہم بے تکلفی سے باتیں کریں گے۔"

انسپکٹر جمشید نے اس وقت تک کے حالات اور واقعات کی ساری تفصیل انھیں سنا دی۔ بعد میں وہ رنگ بھی ان کے سامنے رکھ دیا جو دیوار سے اترنے کے بعد صاف نظر آنے لگا تھا۔ پروفیسر داؤد کچھ دیر تک سوچ میں گم رہے، پھر بولے:

"مجھے تو تم بھی اچھے بھلے سائنسی ذہن کے مالک نظر آتے ہیں، تمھارے اندازوں کی داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ میں تمھاری معلومات میں کچھ زیادہ اضافہ نہیں کر سکتا۔ مکھیاں واقعی لہروں کے ذریعے کنٹرول کی جاتی ہیں اور وہ اس رنگ پر آتی ہیں۔"

"لیکن دور بیٹھے مجرم کو کیسے پتا چل جاتا ہے کہ مکھیوں نے اپنا کام کر دیا ہے اور اب انھیں واپس بلا لینا چاہیے؟"

"ٹیلی وژن کے دور میں یہ کیا مشکل ہے۔ اس نے اسی قسم کا کوئی سسٹم بنا رکھا ہوگا — یا پھر جب مکھیاں اس رنگ کے پاس پہنچ جاتی

ہوں گی تو اس کے آلات پر کوئی خاص اشارا موصول ہوتا ہوگا۔"

"دونوں باتیں ہی ممکن ہیں — اب سوال یہ ہے کہ کیا ہم ہیلی کاپٹر کے ذریعے ان مکھیوں کا تعاقب کر سکتے ہیں، تاکہ ان کا ٹھکانا معلوم کیا جا سکے۔"

"بہتر ہوگا کہ اس سلسلے میں تم پروفیسر ڈی ٹی راؤ سے مل لو — اس سلسلے میں پروفیسر ڈی ٹی راؤ میری نسبت تمہاری زیادہ مدد کر سکتا ہے۔" انھوں نے کہا۔

"بہت بہتر — میں ان سے بھی مل لوں گا۔" یہ کہہ کر انھوں نے رنگ جیب میں ڈال لیا۔ اس دوران میں محمود، فاروق اور فرزانہ شائستہ سے گپوں میں مشغول تھے — محمود ادھر ادھر ٹہلتے ہوئے باتوں کے جواب دے رہا تھا۔

"یہ تم پر ٹہلنے کا بھوت کب سے سوار ہو گیا ہے۔" فاروق نے کہا۔

"جب سے تم پر باتوں کا بھوت سوار ہوا ہے۔" محمود نے فوراً جواب دیا۔

"چلو اچھا ہے — دونوں بھوتوں کی کشتی کرائیں گے۔" فاروق نے شوخ لہجے میں کہا۔

"ظاہر ہے، تمہارا ہی بھوت جیتے گا، ہاں اگر میں تمہارے بھوت کے مقابلے پر لاتوں کا بھوت لے آؤں تو اور بات ہے۔" محمود نے کہا۔

"بھئی واہ، کیا بات کہی ہے — مطلب یہ کہ لاتوں کے بھوت

باتوں سے نہیں مانتے۔" پروفیسر داؤد جو رک کر ان کی گفتگو سننے لگے تھے، چہک کر بولے۔

"لیکن انکل، اس موقع پر یہ جملہ یوں کہا جائے گا — لاتوں کے بھوت باتوں کے بھوتوں سے نہیں مانتے۔" فاروق نے بھی شریر لہجے میں کہا۔

"توبہ ہے، میں کہتی ہوں یہ پروفیسر انکل کا گھر ہے — کوئی بھوت بنگلہ نہیں ہے۔" فرزانہ بولی۔

"اس وقت تو بھوت بنگلہ ہی نظر آ رہا ہے۔" پروفیسر داؤد ہنس پڑے۔

"انکل، آپ ہمیں بھوت کہہ رہے ہیں۔"

"نہیں بھئی، میں نے تمہیں تو نہیں کہا، اپنی کوٹھی کو ضرور کہا ہے۔" وہ مسکرا کر بولے۔

"دیکھا ڈیڈی، ان لوگوں کے آتے ہی گھر میں گویا رونق آ گئی۔" شائستہ خوش ہو کر بولی۔

"ہاں بیٹی، ایسا معلوم ہوتا ہے رونق اور ان لوگوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔" پروفیسر داؤد آہ بھر کر بولے۔

"بالکل غلط انکل، چولی دامن کا ساتھ تو ہمارا اور مکھیوں کا ہے۔" فاروق بول اٹھا — اس پر سب مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔

"تف فاروق۔" محمود جھلایا۔

"یہ میرے نام کے دو ٹکڑے کس خوشی میں کر دیے تم نے۔" فاروق

نے منہ بنایا۔

"چھلا، یعنی کہ رِنگ،" محمود نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

"ہاں، میں جانتا ہوں، چھلے کو انگریزی میں رنگ کہتے ہیں۔" فاروق نے جلدی سے کہا۔

"دھت تیرے کی۔" محمود نے جھلا کر ران پر ہاتھ مارا اور اپنے والد کی طرف مڑا:

"ابا جان، چھلا۔"

"فکر نہ کرو — چھلا میرے پاس محفوظ ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"اوہو ابا جان، میں یہ کہہ رہا ہوں کہ پروفیسر انکل کی دیوار پر بھی ایک عدد چھلا موجود ہے۔"

"نہیں۔"

وہ ایک ساتھ چلائے۔ آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیلتی چلی گئیں —

وہ کون تھا؟

کتنے ہی لمحے سکتے کے عالم میں گزر گئے — پھر انسپکٹر جمشید اچھل کر کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے اس جگہ کھڑے ہو کر دیکھا، جہاں محمود کھڑا تھا — چھلا وہاں واقعی موجود تھا۔

"یا اللہ، تیرا شکر ہے — وقت سے پہلے ہی ہمیں یہ نظر آ گیا، ورنہ نہ جانے کیا ہو جاتا۔" یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید محمود سے چاقو لے کر آگے بڑھے۔

"جمشید رہنے دو۔ کیوں نہ ہم اس موقعے سے فائدہ اٹھائیں۔ میں ابھی یہاں سے نکل جاتا ہوں — میں اور شائستہ رات تمھارے ہاں گزاریں گے۔ یہاں ایک دو آدمی نگرانی کے لیے چھوڑ دیتے ہیں — میرا خیال ہے کہ حملہ کل شام ہی کو ہو گا۔"

"نظر تو یہی آتا ہے۔"

"تو پھر جب میں کوٹھی میں ہوں گا ہی نہیں تو کمبخت میرا کیا بگاڑ لیں گی، اور ہمیں ان کے تعاقب کی تیاری کا پہلے سے موقع مل جائے گا۔"

"ہاں، یہ پروگرام بہت شاندار رہے گا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی اور وہ یہ کہ پروفیسر داؤد کو تو کل مل چکی تھی کہ انہیں ایک گھنٹے کے اندر ختم کر دیا جائے گا، لیکن انہیں آج کیا گیا۔" محمود کو اچانک جیسے یاد آ گیا۔

"مکھیاں بیمار ہو گئی ہوں گی شاید۔" فاروق نے کہا اور وہ مسکرا دیے۔

"اوہ ابا جان، پروفیسر انکل سے ہمیں یہ بھی معلوم کرنا ہے کہ آج کل ان سے کون کون ملنے آیا تھا۔ یہاں آنے والوں میں سے ایک شخص ایسا ضرور ہے جس نے یہ رنگ دیوار سے لگایا تھا۔"

"اوہ، کل سے آج تک صرف ایک شخص یہاں آیا تھا اور وہ کمروں میں بھی گھومتا پھرا ہے۔" پروفیسر داؤد چونک کر بولے۔

"اور وہ کون تھا؟"

"میونسپل کارپوریشن کا آدمی — ڈی ڈی ٹی چھڑکتا پھر رہا تھا گھر گھر، اس کے پاس دوا چھڑکنے کی مشین بھی تھی۔"

"بس تو پھر یہ وہی آدمی تھا — ڈی ڈی ٹی چھڑکنے والے کے روپ میں آیا ہو گا — ذرا ٹھہریے، میں ابھی معلوم کرتا ہوں۔"

یہ کہہ کر انہوں نے عدنان عارف کی بیٹی کو فون کیا۔ ثمینہ کے چچا کا نمبر وہ لکھ لائے تھے۔ دوسری طرف سے ثمینہ عارف نے بتایا کہ اس روز گھر میں ایک شخص مچھروں کے خاتمے کے لیے دوا چھڑکنے آیا تھا۔

یہ سن کر انسپکٹر جمشید نے ایک لمبا سانس لیا اور بولے:

"رنگ لگانے والا آدمی ہی دوا چھڑکنے والا ہے۔"

"ابا جان، خدا کے لیے امی جان کو بھی فون کیجیے، کہیں ہمارے گھر میں بھی تو کوئی ایسا آدمی نہیں آیا۔" فرزانہ نے بوکھلا کر کہا۔

"اچھا۔" یہ کہہ کر انہوں نے گھر کے نمبر ملائے۔ دوسری طرف سے بیگم جمشید نے فوراً کہا:

"جی فرمائیے، آپ کو کس سے بات کرنی ہے۔"

"آپ ہی سے — میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں، آج یا کل کسی وقت کوئی دوا چھڑکنے والا تو نہیں آیا تھا؟"

"اوہ، آپ ہیں — دوا چھڑکنے والا، بالکل آیا تھا — کیوں کیا بات ہے۔" انہوں نے حیران ہو کر کہا۔

"تب پھر تم فوراً بیگم شیرازی کے ہاں چلی جاؤ — ایک لمحے کی بھی دیر نہیں کرنی ہے۔" انہوں نے فوراً کہا۔

"جی کیا مطلب؟" وہ چونکیں۔

لیکن ان کے پاس مطلب بتانے کا وقت کہاں تھا۔ ریسیور رکھ کر فوراً خان رحمان کے نمبر ڈائل کیے۔ لیکن انہوں نے بتایا کہ ان کے ہاں کوئی دوا چھڑکنے والا نہیں آیا۔

"تب پھر ہم لوگ اور پروفیسر صاحب معہ شائستہ تمہارے ہاں آ رہے ہیں۔"

"یہ صلو کس خوشی میں۔" خان رحمان نے بوکھلانے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا۔

"کچھ بوکھلاہٹ محفوظ رکھو، آگے بتاؤں گا۔" یہ کہہ کر انہوں نے سلسلہ کاٹ دیا اور پھر جتنے بھی عزیزوں، دوستوں اور ملنے جلنے وال
کے نمبر ان کے پاس نوٹ تھے۔ انہوں نے ان سبھی کو رنگ کیا اور سوال پوچھا، لیکن اور کسی نے یہ نہیں کہا کہ ان کے گھر میں کوئی ڈی
ٹی چھڑکنے والا آیا تھا۔

"انہیں صرف مجھ سے اور آپ سے خطرہ ہے پروفیسر صاحب" انسپکٹر جمشید فکرمند لہجے میں بولے، پھر اٹھتے ہوئے کہا۔

"اب یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں۔ آئیے چلیں۔ ابھی بیگم کو بھی لینا ہے۔"

تھوڑی دیر بعد وہ خان رحمان کے گھر کے سامنے اتر رہے
محمود نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا تو ظہور کی شکل پر اڑھائی بج رہے

"خیر تو ہے ظہور۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"پانچ مرغ۔" اس نے ایک دم کہا۔

"پانچ مرغ — کیا مطلب؟" وہ چونکے۔

"مطلب یہ کہ آج صاحب نے مجھے پانچ مرغ تیار کرنے
دیا ہے اور وہ بھی پانچ قسم کے — یعنی ہر مرغ مختلف انداز میں
جائے گا۔ انہوں نے بتایا تھا کہ آپ لوگ پہنچ رہے ہیں۔"

"تو کیا تم صرف اس لیے پریشان ہو کہ تمہیں پانچ الگ ا
ہانڈیاں تیار کرنا ہوں گی۔" پروفیسر داؤد نے مسکرا کر پوچھا۔

"جی ہاں، بالکل۔" اس نے کہا۔

"اچھا تو پھر یوں کرو، پانچوں مرغوں کا ایک ہی جگہ قورمہ تیار کرلو۔
ں کے پانچ ذائقے میں بنا دوں گا۔" انسپکٹر جمشید نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"آپ — آپ کیسے بنادیں گے۔ کیا آپ بھی....." وہ کہتے کہتے
ک گیا۔

"ہاں، میں بھی باورچی خانے کا کام جانتا ہوں، تم فکر نہ کرو۔"

"دیکھ لیں جناب، کہیں خان صاحب میرے پانچ گھنٹے تک کان نہ
وادیں۔"

"فکر نہ کرو۔ ہمارے یہاں ہوتے ہوئے وہ ایسا نہیں کرسکیں گے۔"

"تو آپ کے جانے کے بعد کرلیں گے، اس سے انہیں کیا فرق
جائے گا۔" ظہور نے ایسے سادہ انداز میں انکار کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا، میرا وعدہ رہا — وہ ہمارے جانے کے بعد بھی تمہارے
ان نہیں پکڑوائیں گے۔" انہوں نے کہا۔

وہ اس کے ساتھ اندر داخل ہوئے۔ ادھر سے خان رحمان ان
استقبال کے لیے چلے آرہے تھے۔

"السلام علیکم، یار جمشید میری دعا ہے کہ تمہیں ہر روز کوئی
ئی ایسا کیس ملتا رہے جس میں تمہیں میرے ہاں آنا پڑے۔"
انہوں نے نزدیک آتے ہی پرجوش لہجے میں کہا۔

"ابھی دیکھ لو، اس طرح تمہیں ہر روز پانچ مرغ ذبح کرنے پڑا

کریں گے اور ظہور ضرور نوکری سے جواب دے جائے گا۔"

"تم پانچ مرغوں کی پروا نہ کرو — اور ظہور کا کیا ہے — دو چار دن کے لیے جائے گا، پھر آ جائے گا۔"

اس کے بعد سب ایک دوسرے سے گرم جوشی سے ملے — شہناز بیگم تو بیگم جمشید کو الگ گھسیٹ لے گئیں — بچے الگ ایک جگہ جمع ہو گئے اور وہ تینوں الگ۔

"اب بتاؤ چکر کیا ہے۔" خان رحمان بولے۔

"تم اخبار میں پڑھ ہی چکے ہو گے — یہ چکر عدنان حارث کی موت سے شروع ہوا ہے۔"

"اوہ اچھا، میں سمجھا — لیکن تمہیں اور پروفیسر صاحب کو میرے ہاں آنے کی کیا ضرورت پڑ گئی۔"

"اس کی بھی تفصیل سن لو۔" یہ کہہ کر انہوں نے ساری کہانی تفصیل سے سنا دی —

کھانے کی میز پر جب ایک ہی قسم کا مرغ رکھا گیا تو خان رحمان ظہور پر الٹ پڑے —

"ایک لفظ کہے بغیر کان پکڑ لو اور پانچ گھنٹے سے پہلے کان چھوڑنے کی کوشش کی تو اس نوکری کو خیر باد کہنا ہو گا۔"

ظہور کان پکڑنے کے لیے جھکا، لیکن اسی وقت انسپکٹر جمشید اٹھے۔

"نہیں خان رحمان، یہ نہیں ہو گا، اگر کان ہی پکڑوانے ہیں تو میرے
...واؤ۔"

"تمہارے کان پکڑواؤں — کیا بات کر رہے ہو یار، میں ساری دنیا
... کان پکڑوا سکتا ہوں، پر تمہیں نہیں۔"

"ارے مسٹر خان رحمان، اس دنیا میں تو میں بھی موجود ہوں۔" پروفیسر
...د نے انہیں بُری طرح گھورا۔

"اوہ سوری، دراصل میرا مطلب یہ تھا کہ ....!" خان رحمان ہکلائے۔

"میں سمجھتا ہوں، تمہارا مطلب کیا ہے — لیکن آج ظہور کان
...ں پکڑے گا، کیونکہ پانچ طرح کے مرغ پکانے سے اسے میں نے
...ع کیا تھا — آخر ہمارے لیے اتنا تکلف کیوں — ہم کوئی غیر تو نہیں،
...کے ہی آدمی ہیں۔"

"کاش، تم نے ایسا نہ کیا ہوتا۔"

"کیوں؟"

"ظہور پانچ طرح کے مرغ پکانے میں بہت ماہر ہے اور جو اس
... ہاتھ کے پانچ ذائقے چکھ لیتا ہے — ساری عمر بھول نہیں پاتا، میں
... تو یہ سوچ کر اسے اس کا حکم دیا تھا۔"

"اگر یہ بات ہے تو پھر کسی دن سہی — باقاعدہ پروگرام بنایا جائے
... اور اس صورت میں ظہور کو بھی یہ ناگوار نہیں گزرے گا، کیونکہ یہ ذہنی
...ور پر پہلے ہی تیار ہو چکا ہو گا۔"

"ہوں، بات تو تمہاری معقول ہے" خان رحمان نے ہار مانتے ہوئے کہا۔

اور اس طرح کھانا شروع ہو سکا۔ کھانے کے بعد انسپکٹر جمشید، محمود، فاروق اور فرزانہ کو ساتھ لے کر پروفیسر ڈی ٹی داؤد کی طرف روانہ ہو گئے۔ کیونکہ پروفیسر داؤد نے ان سے ملنے کا مشورہ دیا تھا۔ گھنٹی بجانے پر پروفیسر داؤد کی بیٹی، سیما داؤد نے دروازہ کھولا اور ان پر نظر پڑتے ہی چونک اٹھی۔

"آپ لوگ وہی تو نہیں، جو ڈاکٹر جہاں زیب کے سلسلے میں پہلے بھی آ چکے ہیں؟"

"تم نے بالکل ٹھیک پہچانا بیٹی" انسپکٹر جمشید بولے۔

"فرمائیے، آپ اب کس لیے تشریف لائے ہیں؟"

"ہمیں پروفیسر صاحب سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔"

"اچھی بات ہے، اوپر ہی آ جائیں۔ پچھلی منزل میں اب تک کوئی مہمان نہیں آیا" اس نے کہا۔

وہ اس کے ساتھ اوپر ڈرائنگ روم میں پہنچے۔ سیما انہیں بٹھا کر چلی گئی۔ انہوں نے دیکھا، ڈرائنگ روم کی دیواروں پر سائنسی آلات کی بڑی بڑی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ آتش دان پر بھی سائنسی آلات کے ڈیکوریشن پیس رکھے تھے۔ غرض کمرہ ہر طرح ایک سائنس دان کا ڈرائنگ روم نظر آ رہا تھا۔ جلد ہی قدموں کی آواز سنائی دی اور پھر

پروفیسر داؤد کی صورت دکھائی دی۔ علیک سلیک اور اطمینان سے بیٹھنے کے بعد انسپکٹر جمشید بولے:

"آپ نے سن ہی لیا ہوگا کہ مشینی مکھیوں کے ذریعے دو آدمیوں کو ہلاک کر دیا گیا ہے۔"

"ہاں، میں ریڈیو اور اخبار کے ذریعے تازہ ترین خبریں سن چکا ہوں۔"

"آپ کا ان مکھیوں کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"یہ ضرور مشینی مکھیاں ہیں اور انہیں شہد کی مکھیوں کے رنگ میں ڈبو دیا گیا ہے۔"

"کیا ان کا تعاقب کر کے یہ معلوم کرنا ممکن نہیں کہ ان کا ٹھکانا کہاں ہے، یعنی یہ کہاں سے اڑتی ہیں؟"

"لیکن سوال یہ ہے کہ آپ تعاقب کس طرح کریں گے؟"

"ہیلی کاپٹر کے ذریعے۔"

"شاید اس طرح کامیابی کی صورت نظر آ جائے، لیکن میں یقین سے نہیں کہہ سکتا، کیونکہ میں نہیں جانتا، ان مکھیوں کی رفتار کتنی ہے؟" پروفیسر داؤد نے کہا۔

"مکھیوں کی رفتار اتنی زیادہ نہیں ہے۔ ہم جیپ میں ان کا تعاقب کر کے دیکھ چکے ہیں، تاہم جیپ کی نسبت ان کی رفتار زیادہ تھی۔ یوں بھی جیپ سڑک پر دوڑ رہی تھی اور وہ فضا میں پرواز

کر رہی تھیں۔"

"ٹھیک ہے، ہیلی کاپٹر کے ذریعے تجربہ کر لیں۔" اس نے کہا۔ "دوسرے یہ کہ ان مکھیوں کے موجد کو گھر بیٹھے یہ کس طرح پتا چل جاتا ہے کہ مکھیاں اپنا کام مکمل کر چکی ہیں؟"

"ٹیلی وژن کیمروں کے ذریعے۔ آپ یہ کیوں بھول رہے ہیں کہ وہ مشینی مکھیاں ہیں اور ان میں بھی کوئی ایسا آلہ فٹ کیا جا سکتا ہے، جس کی مدد سے وہ اپنی سکرین پر ان مکھیوں کو دیکھتا رہتا ہے۔"

"اوہ، یہ عین ممکن ہے۔ آپ کا خیال بالکل ٹھیک ہے۔ آپ لوگ سابقہ مہمان ڈاکٹر جہاں زیب کا تو کوئی پتا نہیں چلا؟"

"وہ بھلا یہاں کیا لینے آتا۔"

"اچھا جناب، اب ہم چلتے ہیں۔ ہاں، ذرا آپ کے کمرے کی دیواروں کا جائزہ لینا چاہتے ہیں۔" اچانک کسی خیال کے تحت انسپکٹر جمشید نے کہا۔ محمود، فاروق اور فرزانہ انہیں حیرت بھری نظروں سے گھورنے لگے، کیونکہ ایسا کوئی پروگرام نہیں تھا۔

"میرے کمرے کی دیواریں۔ لیکن کیوں؟"

"پروفیسر ماں کے کمرے کی دیوار پر ہمیں ایک چیز چپکی ہوئی ملی ہے اور ہمیں یقین ہے کہ مکھیاں دراصل اس چیز پر آتی ہیں۔"

"اوہ، ضرور یہی بات ہو گی۔ میں بھی اس پہلو پر سوچ رہا ہوں۔ لیکن وہ کیا چیز ہے؟"

"نظر نہ آنے والا ایک چھلا۔"

"اگر وہ نظر نہیں آتا تو آپ نے اسے کس طرح دیکھ لیا؟"

"ایک خاص زاویے سے۔" انہوں نے کہا۔

"تو پھر آیئے۔ ایسا کرنا تو بہت ضروری ہے۔" پروفیسر داؤد اچھل کر کھڑے ہو گئے۔ جلد ہی وہ چاروں کمرے میں کھڑکی کے سامنے والی دیوار دیکھ رہے تھے۔ اور پھر فرزانہ کے منہ سے حیرت زدہ انداز میں نکلا۔

"میرے خدا! چھلا یہاں بھی موجود ہے۔ آخر کار یہ لوگ کتنے لوگوں کو مکھیوں کے ذریعے ہلاک کرنے کا پروگرام بنا چکے ہیں۔"

"کیا کہا، چھلا یہاں بھی موجود ہے۔" پروفیسر داؤد کے منہ سے نکلا۔

"جی ہاں، آیئے، آکر دیکھ لیں۔"

چھلا دیکھ کر پروفیسر داؤد دھک سے رہ گئے۔ ان کا چہرہ خوف سے سفید پڑ گیا۔ انسپکٹر جمشید نے چھلا اتار دیا۔

"یا اللہ رحم، گویا میری موت کا سامان بھی کیا جا چکا تھا۔ لیکن بھلا انہیں مجھ سے کیا خطرہ ہے؟"

"ہو سکتا ہے، آپ ان مکھیوں کے بارے میں کچھ جاننے کے قابل ہوں۔"

"نہیں، میں ابھی تک ان کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں لگا

سکا۔ صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ ... کشتی میں ایک چھوٹی سی مشین فٹ کر دی جاتی ہے۔ اس مشین کو شاید مقناطیسی لہریں کنٹرول کرتی ہیں۔" انہوں نے کہا، پھر بولے:

"اور یہ بات تو اور بھی دو ایک سائنس دان بتا سکتے ہیں۔"

اس نے منہ بنا کر کہا۔

"خیر، اگر آپ خود کو خطرے میں محسوس کرتے ہوں تو اپنی بیٹی اور ملازم سمیت ہمارے ساتھ چلیے اور جب تک یہ کھمبوں والا چکر ختم نہیں ہو جاتا، اس وقت تک آپ ہمارے ساتھ رہیے۔"

"نہیں جناب، مجھے ان کھمبوں سے کوئی خطرہ نہیں۔ خاص طور پر اس وجہ سے ..... کہ چھلاوا نظر آ چکا ہے اور آتا بھی جا چکا ہے"

"خیر تو ہم چلتے ہیں۔ اگر آپ خطرہ محسوس کریں تو پولیس کو فون کر دیں۔ ہم بھی پہنچ جائیں گے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"اچھی بات ہے۔ میں ضرور ایسا ہی کروں گا۔"

وہ پروفیسر ڈی ٹی راؤ سے رخصت ہوئے اور باہر آئے۔

جیپ میں بیٹھتے ہوئے انسپکٹر جمشید نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔

"پروفیسر ڈی ٹی راؤ اور اس کی بیٹی کچھ خوفزدہ سے معلوم ہوتے ہیں۔"

"ظاہر ہے، چھلاوا دیکھنے کے بعد وہ خوف زدہ ہی نظر آئیں گے۔" فاروق نے کہا۔

"نہیں، چھلاوا دیکھنے سے پہلے بھی وہ خوف زدہ تھے اور ..... اور میں تو یہاں تک کہہ سکتا ہوں ....." انسپکٹر جمشید کہتے کہتے رک گئے۔ محمود، فاروق اور فرزانہ انتظار کرتے رہ گئے کہ آگے وہ کیا کہنے والے ہیں، لیکن وہ تو اس طرح خاموش ہو گئے تھے جیسے انہوں نے کچھ کہنے کی کوشش ہی نہ کی ہو۔

آخری معرکہ

عدنان عارف کے بعد پروفیسر طامی کی موت نے شہر میں کھلبلی مچا دی۔ مکھیوں کا خوف ہر شخص پر سوار ہو گیا — ان گنت سوال لوگوں کے ذہنوں میں ابھرنے لگے، مصنوعی مکھیاں کہاں سے آتی ہیں، ان کا خالق کون ہے — وہ کیا چاہتا ہے — اس نے عدنان عارف اور پھر پروفیسر طامی کو کیوں ان مکھیوں کے ذریعے ہلاک کرایا — اس کی ان سے کیا دشمنی تھی اور کیا ابھی وہ کچھ اور لوگوں کو بھی ختم کرائے گا۔

صبح کے اخبار میں انسپکٹر جمشید کا ایک مضمون بھی شائع ہوا تھا جس کا عنوان تھا — مشینی مکھیوں سے کس طرح بچا جائے۔ اس مضمون میں انھوں نے لوگوں کو تمام احتیاطی تدابیر بتا دی تھیں۔ سارے شہر کی پولیس چوکس تھی۔ ہیلی کاپٹر پرواز کے لیے تیار تھے۔ لوگ بدحواس سے تھے — ایک خاموشی کی لہر نے ان سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ یوں لگتا تھا، جیسے یہ خاموشی کسی طوفان کی آمد کا پتا دے رہی ہو۔

وہ سب خان رحمان کے گھر ہی تھے — سب بچوں نے آج سکول سے چھٹی لے لی تھی، لیکن انسپکٹر جمشید دفتر جانے سے نہیں رکے تھے۔

ان کا کہنا تھا کہ مکھیوں کے سلسلے میں وہاں کچھ ضروری کام انجام دینے ہیں — کل پروفیسر ڈی لی رائز کے ان سے واپسی کے وقت وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گئے تھے — محمود، فاروق اور فرزانہ کے بار بار ٹوکنے کے باوجود بھی انھوں نے پھر کچھ نہیں کہا تھا — محمود، فاروق اور فرزانہ ابھی تک اسی سوچ میں گم تھے کہ وہ کیا کہنا چاہتے تھے۔ وہ سوچ بھی رہے تھے — عابدہ، ممدوح، ناز اور شائستہ کا بھی مکھیوں کے سلسلے میں پوری طرح ساتھ دے رہے تھے — ٹھیک چار بجے فون کی گھنٹی بجی — خان رحمان نے شطرنج کی بساط سے سر اوپر اٹھایا اور ریسیور اٹھاتے ہوئے بولے:

"فکر نہ کریں پروفیسر، اس بار آپ کو زبردست مات دوں گا۔"

"مجھے تمہاری زبردست مات کا اچھی طرح پتا ہے۔" پروفیسر داؤد پراعتماد لہجے میں مسکرائے۔

"جی میں پروفیسر نہیں — انسپکٹر جمشید بول رہا ہوں" دوسری طرف سے انسپکٹر جمشید کی آواز سنائی دی۔

"اوہ، جمشید یہ تم ہو یار، وہ.... وہ دراصل میں نے تم سے نہیں، پروفیسر صاحب سے کہا تھا۔"

"تو شطرنج ہو رہی ہے، یار کوئی کام کا کام کر لیا کرو" انسپکٹر جمشید کی جھلاتی ہوئی آواز سنائی دی — انھیں اس قسم کے مشغلوں سے سخت چڑ تھی، جس میں لوگ گھنٹوں ضائع کر دیں —

"بھئی، تم تو سمجھے نہیں — کسی نہ کسی طرح تو وقت گزارا"

تھا۔"

"یہ وقت کھیوں کے موجد کے بارے میں غور کرنے میں ہی گزارا جا سکتا تھا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"میرا اور پروفیسر کا دماغ جاسوسی نہیں ہے بھائی۔"

"اچھا سنو، ٹھیک سوا چار بجے آپ سب لوگ گھر سے نکل پڑو گے۔"

"کیوں، کیا زلزلہ آنے والا ہے؟"

"نہیں، مشینی مخلوق کے حملے کا خطرہ ہے۔ ایسا نہ ہو کسی طرح تمہارے گھر میں بھی چھلا لگا دیا گیا ہو۔"

"ارے باپ رے۔" خان رحمان نے بوکھلا کر کہا، پھر سنبھل کر بولے:

"مگر یار، کل سے اس وقت تک میرے گھر میں کوئی ڈبی ڈبی تو چھڑکنے والا نہیں آیا۔"

"ارے بھئی، یہ ضروری نہیں کہ چھلا لگانے والا کارپوریشن کے آدمی کے روپ میں ہی ہو — کوئی میٹر دیکھنے والا یا بل دینے والا اسی قسم کا کوئی شخص تو آ سکتا ہے اور ہو سکتا ہے، ظاہر ہے اجازت لے کر اندر آ گیا ہو اور اپنا کام دکھا گیا ہو۔"

"اچھا خیر، تو تم یہ چاہتے ہو کہ ہم سب دونوں کاروں میں بیٹھ کر گھر سے نکل کھڑے ہوں اور پھر کیا کریں؟"

"پھر — پھر شہر میں گھومو پھرو — پانچ بجے کے قریب میرے گھر اور پروفیسر صاحب کے گھر کی طرف بھی چکر لگا لینا۔"

"کیوں، ادھر چکر لگانے کی کیا ضرورت ہے؟" انھوں نے پوچھا۔

"کھیوں کی یلغار کا تماشا دیکھنا پسند نہیں کرو گے؟"

"تو کیا تم نے وہاں چھتے لگے رہنے دیے ہیں۔"

"ہاں، اور یہ پروگرام پروفیسر صاحب نے بنایا تھا۔"

"بہت خوب، تو پھر ہم یہ بازی ختم کر لیں — اس کے فوراً بعد اٹھ کھڑے ہوں گے۔" خان رحمان بولے۔

"کہیں ایسا نہ ہو کہ بازی ختم ہی نہ ہو اور رات ہو جائے۔"

"نہیں، یہ ختم ہونے کے بالکل قریب ہے۔ اس وقت پروفیسر صاحب کا بادشاہ میرے پیادوں کے گھیرے میں آیا ہوا ہے۔" خان رحمان نے کہا۔ یہ سنتے ہی پروفیسر داؤد بھی تیزی سے ریسیور پر لپکے اور بولے:

"اور جمشید خان رحمان کا بادشاہ بھی پوری طرح میرے پیادوں کے شکنجے میں ہے۔"

"پھر تو یہ بازی ضرور ہی ختم ہو گی۔" انسپکٹر جمشید جھلا کر بولے — خان رحمان اور پروفیسر داؤد زور سے ہنسے —

☆ ☆ ☆

انسپکٹر جمشید نے آج مشینی مخلوق کے تعاقب کا بہت زبردست انتظام کیا تھا۔ شہر کی تمام بلند عمارتوں پر سادہ لباس والے دوربینیں آنکھوں سے لگائے بیٹھے تھے، وائرلیس سیٹ ان کے پاس موجود تھے۔ سڑکوں پر پولیس کی جیپیں موجود تھیں — ان پر بھی وائرلیس سیٹ موجود تھے۔ ہیلی کاپٹروں میں بھی سادہ لباس والے اس وقت دوربینیں لیے بیٹھے تھے۔ یہ تمام کے تمام لوگ ایک اشارے پر حرکت میں آنے والے تھے — یہ اشارہ انہیں انسپکٹر جمشید سے ملنے والا تھا اور انسپکٹر جمشید اس وقت پروفیسر داؤد کی تجربہ گاہ کے باہر موجود تھے — پروفیسر ڈی ٹی راؤ کی کوٹھی کے گرد بھی پولیس موجود تھی — لیکن چونکہ ان کے کمرے کی دیوار سے چھلا ہٹا لیا گیا تھا، اس لیے وہ اندر موجود تھے؛ تاہم تمام دروازے اور کھڑکیاں انہوں نے بھی بند کر رکھے تھے۔

اچانک مکھیوں کی ایک ڈار پروفیسر داؤد کی کوٹھی کی طرف آتی نظر آئی — انسپکٹر جمشید نے دوربین سے اُسے آتے صاف دیکھا، انہوں نے فوراً اشارہ دے دیا — اس وقت اکرام کا پیغام وائرلیس پر موصول ہوا:

"ہیلو سر! آپ کے گھر پر بھی مکھیاں حملہ آور ہو چکی ہیں۔"

"بہت خوب، لیکن ابھی تک پروفیسر ڈی ٹی راؤ کی طرف سے پیغام نہیں ملا — ٹھہرو، میں خود حوالدار محمد حسین سے بات کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر انہوں نے وائرلیس پر محمد حسین سے بات کرنے کی کوشش کی، جلد ہی اس کی آواز سنائی دی:

"یس سر، حوالدار محمد حسین سر۔"

"حوالدار، تم نے اب تک اطلاع کیوں نہیں دی؟"

"لیکن کیسی اطلاع سر، آپ نے حکم دیا تھا کہ جوں ہی مکھیاں پروفیسر کی کوٹھی کی طرف آتی نظر آئیں، آپ کو اطلاع دی جائے۔ مکھیاں اُڑتی نظر آئیں گی تو اطلاع دوں گا نا جناب۔"

"تو مکھیاں ابھی تک ادھر نہیں آئیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"جی نہیں۔" اس نے فوراً کہا۔

"اچھا خیر، اگر نظر آئیں تو فوراً اطلاع دیں۔"

"جی بہتر۔" اس نے کہا۔

اسی وقت ایک جیپ انسپکٹر جمشید کی جیپ کے پاس آ کر رکی، اس میں آئی جی صاحب اور ڈی آئی جی صاحب موجود تھے۔

"تو حملہ ہو چکا ہے۔"

"جی ہاں، آج ہم ان کا ٹھکانا معلوم کر کے رہیں گے۔"

"اور ٹھکانے پر ان کا موجد بھی موجود ہو گا۔" آئی جی صاحب بولے۔

"بالکل مجھے یقین ہے۔"

اسی وقت بے شمار جیپیں اس طرف آتی نظر آئیں۔ مکھیوں نے اب پروفیسر داؤد کے کمرے کی کھڑکیوں پر حملہ شروع کر دیا تھا۔ ٹک ٹک ٹک شروع ہو گئی تھی — وہ بار بار شیشے سے ٹکرا رہی تھیں اور پیچھے ہٹ رہی تھیں — جیپوں نے فوری طور پر تمام راستوں پر پوزیشن سنبھال

لی — عمارتوں پر موجود دوربینوں والے ہر طرح تیار ہو گئے۔ آس پاس کی عمارتوں کے لوگ حیرت زدہ انداز میں سڑکوں پر ابل پڑے اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس منظر کو دیکھنے لگے — مکھیاں انسانوں کے ہجوم سے بے خبر اپنے کام میں مصروف تھیں۔ ابھی تک حوالدار محمد حسین کا پیغام نہیں ملا تھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ ادھر مکھیوں نے حملہ نہیں کیا — ابھی تھوڑی دیر بھی گزری تھی کہ لقمان رحمان، پروفیسر داؤد اور بچے بھی وہاں آ گئے —

"جمشید، ہم تمہارے گھر سے ہو کر آ رہے ہیں۔ یار، بہت رونق ہے آج تمہارے گھر کے ارد گرد۔" پروفیسر داؤد نے بچوں کی طرح خوش ہو کر کہا۔

"آپ کے گھر میں بھی تو یہی حال ہے۔" انھوں نے پروفیسر صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا — یہ پروفیسر صاحب کی عادت تھی، معمولی باتوں پر بھی بچوں کی طرح بہت خوش ہو جاتے تھے — انہیں چڑچڑے پن سے نفرت تھی — ان کا کہنا تھا کہ آدمی جب بوڑھا ہو جائے تو اسے چڑچڑے پن سے بچنا چاہیے — اس کا چڑچڑا پن خود اس کے لیے حد درجے خطرناک ثابت ہوتا ہے۔ بوڑھے لوگ چڑچڑے پن سے خود اپنا نقصان کرتے ہیں۔ ادھر نوجوان نسل ان سے تنگ آ جاتی ہے۔ لیکن اگر بوڑھے خوش مزاج رہیں، بچوں کی طرح خوش ہوتے رہیں، تو سب ان کا ساتھ دیتے ہیں اور ان کا بڑھاپا ایک خوش گوار عمل

میں گزر جاتا ہے، ورنہ وہ اپنے لیے بھی مصیبت بنتے ہیں اور دوسروں کے لیے بھی —

اچانک انھوں نے شیشہ ٹوٹنے کی آواز سنی — انھوں نے دیکھا، مکھیاں بے تحاشا انداز میں اندر گھس رہی تھیں۔

"دیکھیے پروفیسر صاحب، آپ پر حملہ ہو چکا ہے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے —

"ارے باپ رے —" وہ بوکھلا گئے۔

انسپکٹر جمشید وائرلیس پر ہدایات دینے لگے — دو ہیلی کاپٹر عین اسی وقت پروفیسر صاحب کی کوٹھی پر پہنچ گئے اور چکر لگانے لگے۔ ان کی آواز نے ایک عجیب سماں باندھ دیا — صرف آدھ منٹ بعد مکھیاں باہر ابل پڑیں — وہ ایک قطار کی صورت اختیار کرتی ایک سمت میں روانہ ہو گئیں۔ فوراً ہی جیپوں اور ہیلی کاپٹروں نے ان کا تعاقب شروع کر دیا۔ ادھر سے اکرام کا پیغام ملا:

"مکھیاں، آپ کے کمرے کی کھڑکی کا شیشہ توڑ کر باہر نکل آئی ہیں اور ہم ان کا تعاقب شروع کر چکے ہیں۔"

"بہت خوب، ہم بھی چل پڑے ہیں — تم لوگوں کا رخ شہر کے کس طرف ہے؟"

"شمال کی طرف۔" اکرام نے کہا۔

"ہم بھی اسی طرف جا رہے ہیں — اس کا مطلب ہے آگے

جاکر دونوں کاریں آپس میں مل جائیں گی — اور ہم بھی آپس مل جائیں گے" یہ کہہ کر انہوں نے سلسلہ بند کیا اور حوالدار محمد حسین سے ملایا۔

"تو مکھیاں ادھر نہیں آئیں؟" انہوں نے کہا۔

"جی نہیں" محمد حسین نے کہا۔

"بہت خوب، تم بدستور پروفیسر ڈی ٹی داؤد کی کوٹھی کی نگرانی کرو گے۔ ایسا نہ ہو، ان پر حملہ کسی اور طرح کیا جائے"

"جی بہتر — آپ فکر نہ کریں — میں پوری طرح چوکس ہوں" اس نے جواب میں کہا۔

ہیلی کاپٹروں کی گھن گرج والی آواز — جیپوں کا شور اور مکانوں کی چھتوں پر کھڑے لوگوں کی حیرت بھری آنکھوں نے ایک ایسے منظر کو جنم دے دیا تھا کہ پہلے کبھی دیکھا نہ سنا تھا — یہ تعاقب بھی عجیب تعاقب تھا۔ انہیں یہ خطرہ نہیں تھا کہ انہیں دیکھ لیا جائے گا، اس لیے ہیلی کاپٹر ان کے عین اوپر چل رہے تھے۔ جیپیں بھی تیزی سے چلتی ہوئی کچھ ان سے آگے نکل گئی تھیں اور کچھ پیچھے تھیں — تعاقب کے اس لشکر میں انسپکٹر جمشید کی جیپ تو تھی ہی، خان رحمان اور پروفیسر داؤد کی کاریں بھی تھیں — آئی جی اور ڈی آئی جی صاحبان بھی ایک کار میں تعاقب کرنے والوں کا ساتھ دے رہے تھے؛ گویا آج سب نے مشینی مخلوق کے خلاف ایک محاذ قائم کر لیا تھا۔

اور پھر مکھیاں شہری حدود سے باہر نکل آئیں — اب ان کی رفتار

بہت تیز ہو گئی۔ جیپوں کو تو کیا، وہ ہیلی کاپٹروں کو بھی پیچھے چھوڑ گئیں۔ یہ دیکھ کر ہیلی کاپٹروں کے پائلٹوں نے رفتار ایک دم بڑھا دی — شہر سے نکلتے ہی انسپکٹر جمشید کے گھر سے آنے والے ہیلی کاپٹر بھی ان سے آملے تھے۔ تعاقب کرنے والی دوسری جیپیں بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئی تھیں — لیکن پھر ان کی پریشانی میں اضافہ ہو گیا — ہیلی کاپٹر مکھیوں کی رفتار کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ جیپوں کی تو بات ہی کیا تھی۔ وہ تو مکھیوں سے بہت پیچھے رہ گئی تھیں — انسپکٹر جمشید کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ انہوں نے پائلٹوں سے رابطہ قائم کرتے ہوئے کہا:

"رفتار جس قدر ممکن ہو بڑھا دیں — دور بینوں سے کم از کم یہ معلوم کرنے کی کوشش کرو کہ وہ کس مقام پر ان کی نظروں سے اوجھل ہوتی ہیں"

"بہت بہتر — اب ہم خطرناک حد تک رفتار بڑھا رہے ہیں جناب، آپ فکر نہ کریں"

ہیلی کاپٹروں کی گھن گرج میں بلا کا اضافہ ہو گیا۔ آناً فاناً میں وہ ان سے بہت دور نکل گئے — دور بین میں مکھیاں ابھی تک نظر آ رہی تھیں، لیکن رفتہ رفتہ وہ غائب ہو گئیں — جیپوں کی دوڑ بدستور جاری رہی — وہ رفتار زیادہ نہیں بڑھا سکتے تھے، کیونکہ سڑک کے دونوں طرف کھائیاں تھیں اور آگے پہاڑی سلسلہ شروع ہو گیا تھا — ہیلی کاپٹروں نے آگے جا کر ایک جگہ چکر کاٹنے شروع کر دیے، انسپکٹر جمشید

نے فوراً ان سے رابطہ قائم کیا اور بولے۔

"کیا بات ہے، آپ لوگ آگے جانے کی بجائے چکر کیوں لگانے لگے۔"

"سر! ہم آگے کہاں جائیں۔ مکھیاں اس جگہ کے عین نیچے کہیں غائب ہوتی ہیں — جہاں ہم چکر لگا رہے ہیں۔ ہمارا دعویٰ ہے، وہ اس مقام سے آگے نہیں گئیں۔"

"بہت خوب! لیکن آپ یہ نہیں دیکھ سکے کہ وہ کہاں غائب ہوئی ہیں۔"

"جی نہیں۔" پائلٹ نے کہا۔

"خیر، یہ بھی بہت ہے — ہم آ رہے ہیں — ابھی پورے علاقے کو گھیرے میں لے کر چیک کریں گے۔"

پندرہ منٹ بعد اس علاقے کو گھیرے میں لے لیا گیا تھا۔ یہاں گنتی کے چند مکان تھے۔ بڑے بڑے مکان جو پتھر کاٹ کاٹ کر بنائے گئے تھے — پائلٹوں کو یقین تھا کہ مکھیاں ان میں سے کسی ایک مکان میں داخل ہوتی ہیں۔ انسپکٹر جمشید نے چند پارٹیاں ترتیب دیں، تاکہ یہ پارٹی ایک ایک مکان کی تلاشی لے سکے — پائلٹوں کو ہدایت دی کہ وہ بدستور اوپر چکر لگاتے رہیں — ہر پارٹی کو ایک ایک مکان کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ خود انسپکٹر جمشید، محمود، فاروق، فرزانہ، پروفیسر داؤد اور خان رحمان کو لے کر ایک مکان کی طرف بڑھے۔

"ہماری پارٹی کچھ زیادہ ہی بڑی ہو گئی ہے۔" اس موقع پر فاروق نے کہا۔

"تو تم کسی دوسری پارٹی میں شامل ہو جاؤ — تاکہ کچھ تو تعداد کم ہو۔" فرزانہ نے تڑسے کہا۔

"تم ہر وقت کاٹ کھانے کو کیوں دوڑتی ہو۔"

"اے اے، خبردار — ابا جان آپ دیکھ رہے ہیں اسے۔" فرزانہ نے گویا انسپکٹر جمشید کی مدد لینا چاہی۔

"ہاں! میں تو اس وقت سبھی کو دیکھ رہا ہوں۔" وہ مسکرائے اور اس مکان کے دروازے پر پہنچ گئے جو ان کی پارٹی کے حصے میں آیا تھا۔ اس کے اوپر ایک بڑی سی چمنی موجود تھی — دروازہ بہت بھاری لکڑی کا تھا، یوں لگتا تھا جیسے شہتیر جوڑ کر بنایا گیا ہو —

"اف خدا، اگر کہیں ہمیں دروازہ توڑنا پڑ گیا تو کیا ہوگا۔" فاروق نے کانپ کر کہا —

"فکر نہ کرو، ہاتھیوں کو لے آئیں گے۔" محمود بولا۔

انسپکٹر جمشید نے ایک پتھر اٹھا کر اس سے دروازہ کھٹکھٹایا اور کھٹکھٹاتے چلے گئے لیکن کوئی دروازہ کھولنے نہ آیا — بہت دیر کی کوشش کے بعد بھی دروازہ نہ کھل سکا —

"اب کیا کریں؟" انسپکٹر جمشید بولے۔

"شاید یہاں کوئی نہیں رہتا — کیوں نہ ہم دوسرے مکان کو دیکھیں۔"

"سب مکان ایک ہی وقت میں دیکھے جا رہے ہیں اور ہمیں بہر حال اس مکان کو اندر سے دیکھنا ہے۔"

"تو پھر فاروق کو حکم دیں کہ وہ دیوار پہ پاؤں رکھ کر چڑھتا چلا جائے اور دوسری طرف اُتر کر دروازہ کھول دے۔" فرزانہ نے مسکرا کر کہا۔

"دیکھیں مجھے تاؤ نہ دلاؤ ، ورنہ میں سچ مچ ایسا کر گزروں گا۔" فاروق نے تلملا کر کہا۔

"بھئی، یہ لڑنے کا وقت نہیں ہے۔" انسپکٹر جمشید جھلا کر بولے پھر مڑے اور اپنی جیپ میں بیٹھ کر اسے سٹارٹ کرنے لگے۔

"ارے بھئی، کیا واپس جا رہے ہو۔" خان رحمان بوکھلا کر بولے۔

انسپکٹر جمشید نے کوئی جواب نہ دیا اور جیپ کو مکان کی دیوار کے بالکل ساتھ لگا کر کھڑا کر دیا، پھر بولے:

"یار رحمان، بچپن میں سکول میں ہم ایک کھیل کھیلا کرتے تھے، تمہیں یاد ہے۔"

"لیکن کون سا کھیل — ہم تو نہ جانے کتنے کھیل کھیلا کرتے تھے۔ اگر تمہارا اشارہ کبڈی کی طرف ہے تو اس وقت کبڈی کا کون سا موقع ہے۔"

"کبڈی نہیں یار — منارہ بنانے والا کھیل۔"

"اوہ، تو کیا تم منارہ بنا کر اوپر چڑھو گے۔"

"ہاں، آؤ — جیپ کی چھت پر۔" انسپکٹر جمشید نے سب کو اشارہ کیا۔

"کہیں جیپ کی چھت نہ بیٹھ جائے۔"

"یہ چھت اتنی کمزور نہیں — خاص طور پر بنوائی گئی ہے — آؤ سب سے پہلے ہم کھڑے ہوں گے۔"

انسپکٹر جمشید، خان رحمان اور پروفیسر داؤد ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑ کر کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہو گئے تھے اور پھر بیٹھ گئے۔ اب ان کا اشارہ پا کر محمود اور فرزانہ ان کے کندھوں پر کھڑے ہو گئے — انھوں نے بھی ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیے اور سر آپس میں ملا لیے — پھر وہ دونوں بھی بیٹھ گئے۔

"چلو فاروق، اب تم ایک پاؤں فرزانہ کے اور محمود کے کندھے پر رکھ کر کھڑے ہو جاؤ۔"

"جی بہتر۔" فاروق خوش ہو کر بولا۔

"زیادہ خوش ہوئے تو میں کندھا نیچے سے نکال کر تمہیں گرا بھی دوں گی۔" فرزانہ نے جلے بھنے لہجے میں کہا۔

"گرا دیا — ابا جان ہی پھر تم سے جواب طلب کریں گے۔"

"شاید یہ طریقہ ہم پہلے بھی ایک بار آزما چکے ہیں۔" خان رحمان نے کچھ یاد کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں، مجھے یاد ہے — ہم کسی جنگل کے مکان میں پھنس گئے تھے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

فاروق نے پہلے اپنے والد کے کندھے پر پاؤں رکھا اور پھر محمود کے

پھر ایک پاؤں محمود کے دوسرا فرزانہ کے کندھے پر رکھ کر بیٹھ گیا۔ اب پہلے انسپکٹر جمشید وغیرہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ اس کے بعد محمود اور فرزانہ آہستہ آہستہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ اس کے بعد کھڑا ہونے کی باری فاروق کی آئی۔

"دیکھو تمہارا ہاتھ دیوار کے اوپر تک جاتا ہے یا نہیں؟"

"جاتا ہے ابا جان" فاروق نے خوش ہو کر کہا۔

"پھر اللہ کا نام لے کر چڑھ جاؤ" انسپکٹر جمشید بولے۔

فاروق نے دونوں ہاتھ منڈیر پر رکھے اور بازوؤں کے سہارے اوپر اٹھنے لگا۔ آخر وہ دیوار پر چڑھنے میں کامیاب ہو گیا۔ چند لمحے تک سانس درست کرتا رہا، پھر منڈیر کے دوسری طرف دیکھا اور دھک سے رہ گیا۔ اس طرف اسے کوئی چھت دکھائی نہ دی۔ دیوار سے نیچے گھر کا صحن تھا جو بہت بڑا تھا۔ سامنے ایک کمرے کی دیواریں تھیں اور اس کی چھت پر دھوئیں کی بہت اونچی سی چمنی لگی تھی۔ یہ کمرہ صحن کے ایک طرف تھا۔ لیکن بیرونی دیوار سے ملا ہوا نہیں تھا۔ ورنہ فاروق دیوار پر چلتا ہوا اس کمرے کی چھت پر تو اتر ہی سکتا تھا۔ دوسرے یہ کہ نیچے اسے کوئی بھی شخص نظر نہیں آیا۔ اس نے ساری صورت حال نیچے کھڑے اپنے ساتھیوں کو کہہ سنائی اور بولا۔

"میرا خیال ہے، اس مکان میں کوئی نہیں رہتا۔"

"ہوں، اچھا تم نیچے اتر آؤ۔ کہیں ضرور کسی دوسرے مکان میں گئی

ہیں" انسپکٹر جمشید نے کہا۔ وہ ابھی تک مینارے کی صورت میں کھڑے تھے۔ چڑھنے کی نسبت اترنا فاروق کے لیے مشکل ثابت نہیں ہوا۔ اسے ٹک کر اپنے پاؤں محمود اور فرزانہ کے کندھوں پر ٹکانے پڑے اور بس۔

"یہ کوشش تو بے سود گئی۔ آؤ دیکھیں، دوسری پارٹیوں کا کیا حال ہے" انسپکٹر جمشید نے جیپ کی چھت سے اترتے ہوئے کہا۔

پارٹیاں آہستہ آہستہ واپس آنے لگیں۔ کسی کو بھی کوئی کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ یہ مکان پہاڑوں پر زندگی گزارنے والوں کے تھے اور صدیوں پرانے تھے۔ ان لوگوں کو مفت مل گئے تھے، اس لیے بے چارے یہاں رہنے پر مجبور تھے۔ آخر تمام لوگ واپس آ گئے۔ کسی مکان میں لڑکیوں کا سراغ نہ ملا۔ انسپکٹر جمشید نے اکرام کے ذریعے ایک پہاڑی آدمی کو بلایا۔

"اس مکان میں کون رہتا ہے؟ کیونکہ دروازے پر تالا لگا ہوا نہیں ہے اور اندر سے کوئی جواب ہی نہیں دیتا۔"

"یہ مکان آسیب زدہ ہے جناب، مدتوں سے بے آباد پڑا ہے۔ اس میں کوئی نہیں رہتا۔"

"لیکن دروازہ تو اندر سے بند ہے۔"

"جنوں اور بھوتوں نے بند کیا ہو گا۔ میں کیا کہہ سکتا ہوں۔"

"ہوں، اکرام وہ بڑی بڑی لکڑی کی سیڑھیوں کا بندوبست کرو، اگر اس بستی سے نہ مل سکیں تو شہر سے لانا پڑیں گی۔"

"جی بہت بہتر۔"

آدھ گھنٹے بعد سیڑھیاں وہاں موجود تھیں — اس مکان کی دیوار سے سیڑھی لگائی گئی — انسپکٹر جمشید دیوار پر چڑھے اور دوسری سیڑھی انھوں نے اوپر کھینچ کر مکان کے اندر کی طرف دیوار سے لگا کر کھڑی کر دی۔

"محمود، فاروق، فرزانہ میں نیچے اتر رہا ہوں —" "تم تینوں دیوار پر آ کر ٹھہر جاؤ — میری طرف سے اشارہ ہو تو تم بھی نیچے آ جانا۔"

"جی بہتر۔" تینوں نے ایک ساتھ کہا اور سیڑھی پر چڑھنے لگے — باقی سب لوگ مکان کے سامنے جمع ہو گئے — آس پاس رہنے والے بھی یہ تماشا دیکھنے کے شوق میں جمع ہو گئے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ ہو کیا رہا ہے —

ادھر انسپکٹر جمشید دوسری سیڑھی کے ذریعے نیچے اتر کر اس کمرے کی طرف بڑھے۔ دروازے کی جھری کے ذریعے انھوں نے اندر جھانک کر دیکھا، اور پھر چونک اٹھے — انھوں نے محمود، فاروق کو نیچے آنے اور دوسروں کو بھی بلا لینے کا اشارہ کیا — پھر بیرونی دروازے پر نظر ڈالی — اس میں ایک شٹر پھنسا ہوا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس دروازے کو آمد و رفت کے لیے استعمال نہیں کیا جاتا تھا —

جلد ہی باقی سب لوگ ان تک پہنچ گئے — اب انسپکٹر جمشید نے دروازے پر دباؤ ڈالا — وہ بھی بھاری لکڑی کا تھا! تاہم اندر سے بند نہیں تھا۔ ہلکی سی چرچراہٹ سے کھل گیا۔

اندر کا منظر ان سب کے لیے حیران کن تھا۔ یہ ایک طویل و عریض کمرہ تھا اور کسی بہترین تجربہ گاہ کا منظر پیش کر رہا تھا۔ شاید پروفیسر داؤد کی تجربہ گاہ بھی اتنی شاندار نہ رہی ہو گی۔ وہ بھی اسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے — یہاں ٹیلی ویژن کیمرے بھی تھے اور سکرین بھی لگی تھی — چھت پر نظر آنے والی چمنی آتش دان پر آ کر ختم ہو گئی تھی، لیکن اس جگہ اس چمنی کا پھیلاؤ بہت زیادہ ہو گیا تھا — آتش دان بہت لمبا چوڑا تھا اور اس میں اس وقت ہزاروں مکھیاں بھری پڑی تھیں — مشینی مکھیاں، جو نیلگوں رنگ کی تھیں — اس وقت یہ مردہ حالت میں پڑی تھیں — آتش دان کے پاس آرام دہ کرسی میں ایک آدمی آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔ اس کی ٹانگیں پھیلی ہوئی تھیں، یہ ایک جوان آدمی تھا — مضبوط ہاتھوں پیروں والا، بھرے بھرے گوشت والا، شاید وہ گہری نیند سو رہا تھا! ورنہ اتنے بہت سے لوگوں کے اندر داخل ہونے پر آنکھیں کیوں نہ کھولتا — انسپکٹر جمشید نے ایک نظر اپنے تمام ساتھیوں پر ڈالی — اسے محمود، فاروق اور فرزانہ کی آنکھوں میں سب سے زیادہ حیرت نظر آئی — اور حیرت کیوں نہ ہوتی — ڈاکٹر جہاں زیب کو یہاں دوبارہ دیکھ کر حیرت تو انہیں ہی ہونی تھی۔

"ابا جان! کیا ہماری آنکھیں دھوکا کھا رہی ہیں؟"

"نہیں، یہ وہی شخص ہے جو عدنان عمارت کے ایک بم سے اڑ گیا تھا، لیکن یہ ڈاکٹر جہاں زیب نہیں ہے — وہ نام تو اس نے عارضی طور

پر استعمال کیا تھا۔"

"تو پھر یہ کون ہے؟"

"ارے بھئی، تم ابھی تک نہیں سمجھے کہ یہ کون ہے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے —

"ہائیں، تو کیا آپ جانتے ہیں؟"

"ہاں، بہت پہلے میں اندازہ لگا چکا ہوں کہ ان مکھیوں کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے؟"

"بہت خوب انسپکٹر جمشید — میں تمہاری ذہانت کو مان گیا، لیکن افسوس، اب تمہاری ذہانت تمہارے ملک کے کام نہیں آسکے گی۔"

انہوں نے چونک کر دیکھا — سوئے پڑے شخص نے آنکھیں کھول دی تھیں۔ اس کے چہرے پر ایک دلکش مسکراہٹ ناچ رہی تھی — انہوں نے اس مسکراہٹ کو حیرت بھری نظروں سے دیکھا۔

***

"ارے، یہ تو جاگ رہا ہے۔"

"اپنی مخلوق کے تعاقب میں ہیلی کاپٹروں کو آتے دیکھ کر میں کس طرح سو سکتا تھا — میں نے تمہارے استقبال کی تیاریاں کر لی تھیں انسپکٹر — دیکھ لو، میں یہاں بالکل تنہا ہوں۔ تنہا ہی میں نے یہ سب

ایجاد کیا ہے — یہ میری برسوں کی محنت ہے — میں یہ کس طرح برداشت کر سکتا ہوں کہ تم اسے چند منٹ میں تباہ کر دو۔ دراصل وہی خوفناک موت تمہارا مقدر بن چکی ہے جو علامہ عارف اللہ، پروفیسر حامی کی ہوئی ہے۔"

"لیکن ان لوگوں کا قصور کیا تھا؟" انسپکٹر جمشید نے سوال کیا۔

"مجھے حیرت ہے کہ تم نے یہ سوال کیا — تمہیں تو یہ پوچھنا چاہیے تھا کہ تم اس وقت موت کی لپیٹ میں کس طرح ہو۔"

"یہ تو ہم بعد میں معلوم کر لیں گے، کیونکہ موت کا ہمیں اتنا خوف نہیں، جتنا یہ جاننے کا شوق ہے کہ آخر تم نے علامہ عارف اللہ، پروفیسر حامی کو کیوں ہلاک کیا ہے۔"

"دراصل میں نے یہ ایجاد کچھ عرصے کے لیے فروخت کر دی ہے، لیکن استعمال کا کام اپنے ہی ہاتھ میں رکھا ہے۔"

"فروخت کر دی ہے، کیا مطلب؟" وہ چونکے۔

"ٹھہرو، میں شروع سے آپ کو بتاتا ہوں — میں برسوں سے اس ایجاد کے چکر میں تھا — اس سلسلے میں پروفیسر حامی سے مجھے بہت مدد ملی، اسے میں نے یہ بتایا تھا کہ یہ ایجاد ملک اور قوم کے بہت کام آئے گی — دیکھو، اسے دشمن ملک کی فوجوں کے خلاف بڑے مزے سے استعمال کیا جا سکتا ہے — زہر کا کیا ہے — وہ تو ان مکھیوں کی ٹانگوں پر کوئی بھی لگایا جا سکتا ہے — شہد کی مکھیوں کے زہر ہیں جن میں نے ایک اور زہر ملا رکھا ہے — موت دراصل اس سے واقع ہوتی ہے، لیکن وہ

زیادہ مقدار مکھیوں کے زہر کی ہے — اس لیے اس زہر کا پتا نہیں چلتا۔
چنانچہ اس دوا میں نے پروفیسر نامی سے بہت مدد لی — آخر میں اس
تجربے میں کامیاب ہو گیا — میں نے یہاں سے کچھ فاصلے پر دو جانوروں
پر تجربہ کیا — مکھیاں دراصل مقناطیسی لہروں کے ذریعے سفر کرتی ہیں —
سمت میں یہاں سے ہی متعین کرتا ہوں — میرا تجربہ کامیاب رہا —
دونوں جانوروں کی لاشیں ملیں — وہ رنگ بھی مقناطیسی لہریں خارج
کرتا ہے، اس لیے مکھیاں اس کی طرف کھنچتی ہیں۔ ورنہ انہیں آدمیوں
سے کوئی غرض نہیں ہوتی — خوف زدہ آدمی خود کو بچانے کے لیے دیوار
سے جا لگتا ہے اور مکھیاں پیچھے سے چمٹنے کی بجائے اس سے جا ٹکراتی
ہیں — ان کی ڈنکیں ہاتھوں پر لگا ہوا زہر اس آدمی کے جسم میں داخل
ہو جاتا ہے — تجربہ مکمل کرنے کے بعد میرے ذہن میں بے تحاشا دولت
کمانے کا ایک خیال پیدا ہوا — میں نے دشمن ملک سے بات کی، اُسے
بتایا کہ میں نے کیا چیز ایجاد کی ہے اور تجربے کے طور پر وہ جسے کہیں
میں اپنی ایجاد کے ذریعے ختم کر کے دکھا دوں — انہوں نے یہ بات منظور
کر لی — میں نے مختلف بنکوں میں اکاؤنٹ کھول لیے اور ان کے
نمبر انہیں بتا دیے — انہوں نے اپنے ایجنٹوں کے ذریعے میرے
اکاؤنٹوں میں بھاری رقوم جمع کرا دیں اور مطالبہ کیا کہ تجربے کے
طور پر عدنان عارف کو ختم کر کے دکھایا جائے؛ چنانچہ میں نے
اسے ختم کر دیا — اب دشمن ملک میری ایجاد بے تحاشا دولت دے کر

خریدنے کے لیے تیار ہے — جب کہ میں ابھی اسے فروخت نہیں کروں گا
اور جو سب سے زیادہ بولی لگائے گا، ایجاد اس کے حوالے کر دوں گا،
ظاہر ہے وہ لوگ مجھے کوئی نقصان بھی نہیں پہنچا سکتے۔ کیونکہ ایجاد
میرے بغیر بے کار ہے — یہ مقناطیس کے ٹکڑے ہیں اور بس۔"

"ہوں، تو یہ بات ہے، لیکن تم نے پروفیسر نامی کو کیوں
ہلاک کیا اور اسے دھمکی ایک دن پہلے ہلاک کرنے کی دی تھی، دوسرے
دن کیوں ہلاک کیا؟" انسپکٹر جمشید نے پوچھا۔

"اس روز میری طبیعت اچانک خراب ہو گئی اور میں یہاں نہ آ
سکا — نامی نے عدنان عارف کے مکھیوں کے ذریعے ہلاک ہونے
کے بعد مجھ سے فون پر بات کی تھی اور کہا تھا کہ میں فوراً ایجاد کو
حکومت کے حوالے کر دوں؛ ورنہ وہ میرے بارے میں حکومت کو بتا
دے گا، لیکن میں نے اسے دھمکی دی کہ میں اسے ختم کر دوں گا — شاید
وہ اسے مذاق سمجھا اور اس نے میرے بارے میں نہ بتایا — بتا بھی دیتا تو
بھی میں آپ لوگوں کے ہاتھ نہ آتا۔"

"بہت خوب، سب کچھ واضح ہو گیا، لیکن یہاں سوال یہ پیدا ہوتا
ہے کہ دشمن ملک کو عدنان عارف سے کیا دشمنی تھی؟"

"سنا ہے، وہ بہت ایماندار آدمی تھا۔" نقلی ڈاکٹر جبار نے بتایا۔

"ایک اور بات بھی ہو سکتی ہے — ان دونوں ایک بہت بڑے جرم

کی تعمیر کا ٹھیکہ دیا جانے والا ہے۔ ہو سکتا ہے، دشمن ملک اپنے کسی آدمی کو ٹھیکہ دلوانا چاہتا ہو — تاکہ ڈیم ناقص تعمیر ہو اور ملک کو ایک عظیم نقصان پہنچے اور خوفناک خطرہ لاحق ہو جائے۔" آئی جی صاحب بولے۔

"اوہ، ضرور یہی بات ہے — خیر، ہم اس شخص کی نگرانی کریں گے، جسے ٹھیکہ ملتا ہے اور اس کی بجائے کسی دیکھے بھالے ایماندار ترین آدمی کو ٹھیکہ دلوائیں گے — ساتھ ہی یہ بھی دیکھنا پڑے گا کہ عدنان عارف کی سیٹ سنبھالنے والا فرقان لودھی رشوت لے کر تو کسی کو ٹھیکہ نہیں دیتا۔ آپ فکر نہ کریں، میں اس کا مکمل بندوبست کر لوں گا۔" انسپکٹر جمشید نے پرسکون لہجے میں کہا۔

"لیکن انسپکٹر صاحب، مجھے افسوس ہے — اس مکان میں اترنے والا ہر آدمی مکھیوں کے زہر کا شکار ہو جائے گا۔ جب تم نے دستک دی تھی، تو میں اسی وقت سمجھ گیا تھا کہ تم لوگ ہی آ سکتے ہو۔ میں نے جان بوجھ کر دروازہ نہیں کھولا تھا اور اس میں شہتیر اڑا دیا تھا۔ اس کے بعد میں نے اپنے سامنے والی دیوار پر بے شمار چھتے لگا دیے تھے۔ اب وہ چھتے تمہاری کمر پر ہیں اور میری انگلی اس بٹن پر، جس کے ذریعے مکھیاں حرکت میں آئیں گی — آناً فاناً میں تم تک پہنچ جائیں گی، کیونکہ کچھ زیادہ فاصلہ تو طے کرنا نہیں ہے — لو میں بٹن دبانے لگا ہوں — خدا حافظ، اب تمہاری میری ملاقات ......"

"ایک منٹ — اس کام میں تمہارا معاون کون ہے؟"

"کوئی بھی نہیں، سب کام میں خود ہی کرتا ہوں — کسی کو رازدار بنا کر میں مصیبت مول نہیں لے سکتا تھا —" اس نے کہا۔

"ہمیں ختم کر کے بھی تم نہیں بچ سکو گے، کیونکہ باہر بھی بے شمار لوگ موجود ہیں اور وہ ہمیں اندر داخل ہوتے دیکھ چکے ہیں۔"

"پروا نہیں، میں تمہیں ختم کرتے ہی چور دروازے کے راستے یہاں سے رخصت ہو جاؤں گا اور جاتے ہوئے اپنی ایجاد بھی لے جاؤں گا۔ اب میرے پاس اتنی دولت ہے کہ میں بہت بڑی تجربہ گاہ بنا سکتا ہوں۔"

"تو کیا کارپوریشن کے آدمی کے روپ میں بھی تم ہی جاتے رہے ہو؟" محمود نے پوچھا۔

"ہاں، میں نے کہا نا، میں نے کسی سے کوئی مدد نہیں لی۔"

"بہت خوب، اب سنو، تمہارے خیال میں ہم موت کے دہانے پر کھڑے ہیں، لیکن ہمارا خیال یہ ہے کہ موت ہماری نسبت تم سے زیادہ قریب ہے —" انسپکٹر جمشید نے پریقین لہجے میں کہا۔

"میں ان باتوں میں آنے والا نہیں — اس سے پہلے کہ تم میں سے کسی نے کوئی حرکت کی — میں بٹن دبا دوں گا، بلکہ دبا دیتا ہوں گا، یہ لو —"

ان الفاظ کے ساتھ ہی اس کے حلق سے ایک بھیانک چیخ نکلی

دونوں ہاتھ یک دم آنکھوں پر جا لگے۔ فرزانہ کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے ہیئر کلپ سے اندھا کر دینے والی شعاع نکلی تھی۔ دوسرے ہی لمحے وہ فرش پر گرا اور تڑپنے لگا۔

"ارے ارے، یہ میری آنکھوں کو کیا ہو گیا ہے — ان میں یہ آگ کس طرح گھس گئی ہے" وہ چلایا۔

"بات دراصل یہ ہے میرے دوست، کہ اس ملک میں تمہارے علاوہ بھی کچھ سائنس دان موجود ہیں —"

"اور یہ ان کی ایک ادنیٰ سی ایجاد ہے جسے ہم لوگ بطور کھلونا استعمال کرتے ہیں، گویا ہم نے تمہیں ایک کھلونا دے کر بہلا دیا ہے، کہیں تمہیں یہ حسرت نہ رہ جائے کہ کھلونے دے کے بہلائے گئے ہیں" فاروق نے کہا۔

"حیرت ہے، آخر اس کی آنکھوں کو کیا ہوا؟"

"فرزانہ کے ہاتھ میں پروفیسر داؤد کا بنایا ہوا ہیئر کلپ تھا اور یہ اسے پہلے ہی ہاتھ میں لے کر اندر داخل ہوئی تھی۔ اسے کسی کے ہاتھ میں کوئی ہتھیار نظر نہیں آیا، نہ کسی نے حرکت کرنے کی کوشش کی — لہٰذا یہ مطمئن رہا" انسپکٹر جمشید نے بتایا۔

"لیکن یہ ہے کون؟"

"پروفیسر ڈی پی راؤ کا اسسٹنٹ ڈاکٹر مور — اکرام! اس کی شناخت کے لیے پروفیسر صاحب اور ان کی بیٹی کو دفتر لے آنا۔"

"جی بہتر"

"اور پروفیسر صاحب اس ایجاد کو اب آپ سنبھالیے۔ ہم اسے ملک اور قوم کی خدمت کے لیے استعمال کریں گے۔ خدانخواستہ جنگ چھڑی تو مکھیوں کی فوج دشمن کی طرف روانہ کریں گے۔"

"لیکن ابا جان، اس کے لیے تو ہمیں دشمن کے عقب میں چھتے لگانے پڑیں گے۔"

"پھر کیا ہوا — ان کی فوج میں ہمارے جاسوس بھی تو موجود ہیں۔"

"چھوڑیے جناب، چلیں — بہت ادھم مچایا تھا آپ نے، ایک اکیلے مجرم کو پکڑنے کے لیے اتنی جیپیں اور چار ہیلی کاپٹر استعمال کرنے پڑے — توبہ ہے" فاروق نے کہا۔

"اور توبہ ہے تمہاری زبان سے — مجھے افسوس یہ ہے کہ مجھے اپنا لائیٹر استعمال کرنے کا موقع نہیں ملا" محمود نے بُرا سا منہ بنایا —

"تو میں بھی اپنا پستول کب استعمال کر سکا ہوں" فاروق بولا۔

"دراصل ہیئر کلپ ایک چھوٹی اور بے ضرر سی چیز ہے۔ اسے ہاتھ میں دیکھ کر مجرم کوئی خیال نہیں کرتا — ورنہ تم اپنا کلپ میرے پستول سے بدل نہیں لیتیں"

"جی نہیں — کیونکہ مجرم تمہارے ہاتھ میں کلپ دیکھ کر [illegible]

پڑا کریں گے۔ وہ سوچیں گے۔ ایک لڑکے کے ہاتھ میں پیر کیپ کا کیا مطلب ہے۔ یہ اس لڑکی کے ہاتھ میں کیوں نہیں ہے؟"

فرزانہ کی بات پر سب نے ایک قہقہہ لگایا اور وہ واپسی کی تیاری کرنے لگے۔

منی آرڈر مکتبہ اشتیاق کو بھیج کر گھر بیٹھے بھی حاصل کر سکتے ہیں، لیکن منی آرڈر یکم نمبر تک موصول ہو جانے چاہئیں۔

اور اب ناول کی جھلکیاں

* محمود، فاروق اور فرزانہ نے انسپکٹر جمشید کا گھیراؤ کرنے کا اعلان کر دیا۔
* گھیراؤ کی خبر سن کر خان رحمان ان کے گھر دوڑ پڑے۔
* پروفیسر داؤد بھی ان کے گھر کی طرف روانہ ہوئے، لیکن وہاں تک پہنچ نہ سکے۔ ... آخر کیوں؟
* ملک کے مشرقی حصے سے ایک پراسرار آدمی کی آمد۔
* پراسرار آدمی پر ایک شخص کا حملہ .... اسے بچاتے ہوئے اکرام کی اپنی زندگی خطرے میں پڑ گئی ....
* حملہ آور کی جیب سے نکلنے والی چیز انتہائی عجیب تھی۔
* انسپکٹر کامران مرزا نے ایک خطرناک ہوٹل میں شامت کو آواز دے ڈالی، منور علی خان انہیں موت کے منہ میں جاتے دیکھ کر بے تاب ہو گئے۔
* ایک اور بڑے مجرم سے ملیے ..... آپ نے اس کا صرف نام ایک ناول میں سنا تھا۔
* انسپکٹر جمشید اور انسپکٹر کامران مرزا پارٹیوں کی آپس میں ملاقات عجیب و غریب اور دلچسپ ترین انداز میں ہوئی، آپ قدم قدم پر مسکرائیں گے۔
* ایک پراسرار ریسٹ ہاؤس جو بعد میں خونی ریسٹ ہاؤس ثابت ہوا۔

* انہیں اس ریسٹ ہاؤس میں چند دن گزارنے پڑے ....
* شمبولیا۔ ایک ملک جو آگ کا سمندر بن گیا۔
* ایک پراسرار چوری کی واردات .... چور کا نام جان کر آپ اچھل پڑیں گے۔
* نشانہ بازی کا ایک حیرت انگیز مقابلہ۔
* گلیشیر کے نیچے آبدوز میں سفر۔ سفر کے دوران آبدوزوں کی جنگ ــ اور پھر سمندر میں آگ لگ گئی۔
* آبدوز پر ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔
* ایک ہولناک جزیرے پر ایک حیرت انگیز ملاقات، اس جزیرے پر ایک ہولناک ڈرامہ کھیلا گیا۔
* برف سے بنی ایک وادی کے چوک میں برف کے ستونوں سے چھ لاشیں لٹک رہی تھیں۔
* اس بار انسپکٹر جمشید بھی آپ کو دو باتیں سنائیں گے۔
* ایک ایسی وادی کی کہانی ... جہاں وہ بے بس تھے، ان کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا اور انہیں چار سو مسلح آدمیوں سے جنگ لڑنا تھی، یہ جنگ کس طرح لڑی گئی۔
* محمود، فاروق، فرزانہ، آفتاب اور فرحت کی شوخیوں اور شرارتوں کے طوفان سمیٹے ایک ضخیم ناول۔

کالا طوفان کا انعامی سوال

جواب یہ تھا:

طوفان کا انجام

صرف ایک درست جواب موصول ہوا۔ نام پتا درج ذیل ہے۔ انہیں انعامی پیکٹ روانہ کیا جا رہا ہے۔

ندیم حسن

معرفت

عبدالحمید سیٹھی۔ مکان نمبر ۱۳/۸۸
پرانا قلعہ، جامع مسجد روڈ۔ راولپنڈی

پیارے دوست اشتیاق احمد السلام علیکم! مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کے خط کا جواب نہ دے سکا، دراصل میں یہاں نہیں تھا۔ انعامی پیکٹ موصول ہوا، یقین نہیں آ رہا کہ آپ نے مجھے انعامی پیکٹ بھیجا ہے۔ اس بار کے بھی ناول بہترین تھے۔ دوسرے آپ نے ٹائٹلوں پر بھی توجہ دینی شروع کی ہے اور ٹائٹل اس مرتبہ بہت اچھے تھے، دیکھ کر مزا آگیا، میری طرف سے اتنا اچھا لکھنے اور اتنے اچھے ٹائٹل بنانے پر مبارک باد قبول ہو....
اور چغتائی صاحب کو مبارک باد۔

(آپ کا دوست انجم حمید رانا ۵/۳۰۲ بٹالہ کالونی فیصل آباد)

ڈیئر انکل اشتیاق احمد! السلام علیکم کے بعد عرض ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے، کیونکہ آپ نے تو دن رات دولت کو بےرحم لوٹنے کا جو منصوبہ بنایا ہے وہ پورا ہو رہا ہے یہی وجہ ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔

عرض ہے کہ آپ کے ناول بقول آپ کے بڑوں کے لیے یعنی "باہر کا آدمی" میں ایک افسانہ جس کا عنوان "خاب" "چھ سال بعد" ہے۔ آپ نے ایک اخبار سے چرایا ہے، کہیں سے کہانی چرانا تو آپ کا بائیں ہاتھ کا کھیل ہے، اگر آپ کو یقین نہ آئے تو میں آپ کو اخبار کا تراشہ بھیج دوں گا۔ بہرحال مجھے افسوس ہے کہ کسی کا لکھا ہوا افسانہ یا کوئی اور دوسری چیز چرانا نہایت گری ہوئی حرکت ہے۔ اگر آپ کے پاس اس کا کوئی ثبوت ہو کہ یہ افسانہ آپ نے خود لکھا ہے تو آپ ثبوت پیش کریں۔

(ذوالفقار احمد ضلع گوجرانوالہ)

ج: واقعی یہ ذلیل حرکت ہے، میرا یہ افسانہ ۲۲ جنوری کے اردو ڈائجسٹ میں چھپا تھا اور میرے پاس اس رسالے کے صفحات موجود ہیں۔ آپ دفتر میں آکر دیکھنا پسند کریں گے یا آپ کو فوٹو سٹیٹ کرا کے بھجواؤں اور آپ نے اپنا پتا کیوں نہیں لکھا۔

عزیز بھائی جان! آداب، ناول پڑھے، آپ نے تو اس مرتبہ کمال ہی کر دیا، مارکیٹ میں اس وقت جو دوسرے ناول آ رہے ہیں، گھٹیا قسم کے ہیں، یہ ناول پڑھ کر ہمیں خوشی ہوئی ہے، ان جو مضمونوں پر آپ کے ناولوں کی مقبولیت کا اندازہ اس سے بھی ہو جاتا ہے کہ اگر آپ ناولوں کے ڈائجسٹ میں آنے کے دو تین دن بعد جائیں تو ناول کہیں ملتے ہی نہیں۔ تیسرا خاص نمبر جلد از جلد لکھیے اور ہاں، حسد کرنے والوں کے منہ

شائع نہ کیا کریں۔
آپ کے بھائی: محمد عبداللہ، محمد آصف مکان نمبر ۱۲، آریہ سماج
سٹریٹ نمبر ۲۷، اچھرہ لاہور

انکل اشتیاق! میری والدہ اس دنیا میں نہیں۔ میرے ابو فرانس میں ہیں اور
میں یہاں ماموں کے پاس رہتا ہوں۔ امی کی موت نے مجھے بہت نازک دل بنا دیا ہے،
ذرا ذرا سی بات پر رو پڑتا ہوں۔ خاص طور پر اس وقت جب میری کسی التجا کو
ٹھکرا دیا جائے۔ ماہ جون کے ناول پسند آئے۔ خاص نمبر اکتوبر میں شائع ہوگا اور میں
۱۰ ستمبر کو ابو کے پاس فرانس جا رہا ہوں۔ آپ کے آنے والے ناولوں کے لیے میں
پاکستان میں رکا ہوں، ورنہ ابو نے پچھلی جولائی کی سیٹ بک کرائی تھی۔ خاص نمبر اگر
اگست میں شائع کر دیں تو میں بے حد شکر گزار ہوں گا۔

محمد سلمان احمد مسعود۔ لاہور

ج: آپ نے اپنا پتا نہیں لکھا۔ خاص نمبر پروگرام سے پہلے کس طرح آ سکتا ہے۔ تاہم
اگر آپ اپنا فرانس کا پتا لکھ دیں تو وہاں آپ کو وہیں بھیج دیا جائے گا۔۔۔ آپ پتے
نہیں بھیج سکتے تو کوئی بات نہیں۔